احمد یار خان

# پیار کا پُل صراط

جرائم اور سُراغ رسانی کی پانچ سچی سنسنی خیز کہانیاں

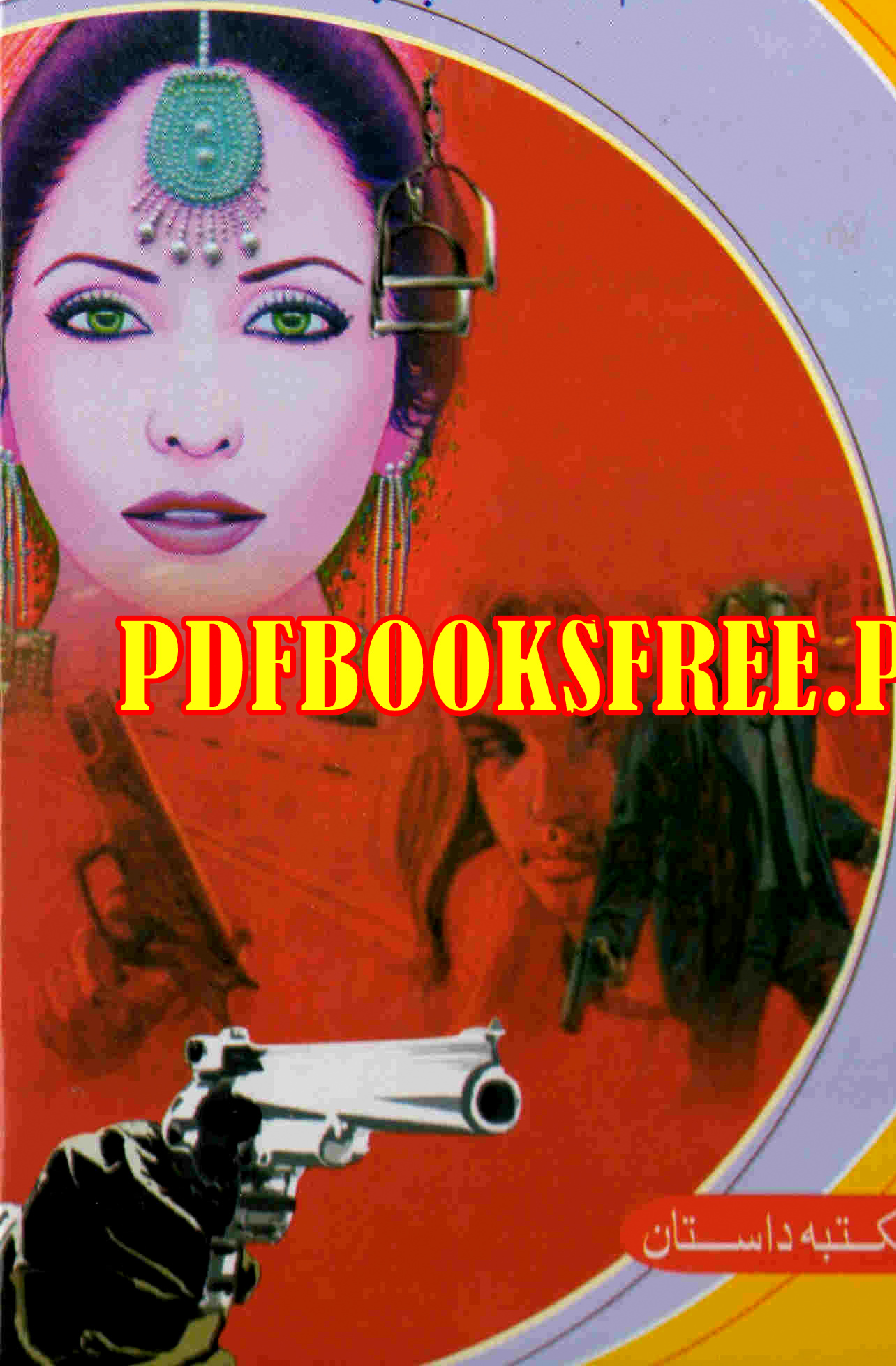

PDFBOOKSFREE.PK

مکتبہ داستان

# پیار کا پُل صراط

جرائم اور سُراغ رسانی کی پانچ سچی اور سنسنی خیز کہانیاں

احمد یار خان


واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

# فہرست


| | |
|---|---|
| ناجو کا جن | ۷ |
| باپ بیٹا | ۴۸ |
| پیار کا پُل صراط | ۹۴ |
| خدا کا مرید | ۱۳۲ |
| ماں بیٹی اور بیٹا | ۱۷۶ |

# ناجو کا جنّ

جنّات اور جنّات کو قبضے میں رکھنے والے عاملوں اور پیروں فقیروں ور جنّات کے قبضے میں آتے ہوئے انسانوں کی دُنیا کی یہ کہانی آپ کے لئے نئی نہیں ہوگی۔ آپ کے گاؤں یا محلّے میں ایسے ایک دو آدمی یا عورتیں ضرور ہوں گی جنہیں جن "پڑتے" ہیں اور آپ کے علاقے میں جن نکالنے والا بھی کوئی "پہنچ والا" شاہ ضرور موجود ہوگا۔ آپ جنّات کا کسی عامل کے قبضے میں اور کسی انسان کا جنّات کے قبضے میں آنا اُسی عقیدت سے سچ مانتے ہوں گے جس طرح آپ نماز، روزہ، زکوٰۃ کو مانتے ہیں۔

یہ ایک پُراسرار دُنیا ہے جس میں جنّوں اور انسانوں کے تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں۔ آج میں آپ کو اسی دُنیا کی ایک تفتیشی کہانی سناتا ہوں۔ مجھے روکا گیا تھا کہ میں اُس پُراسرار اور خطرناک دُنیا میں نہ جاؤں کیونکہ وہاں میری تھانیداری نہیں چلے گی۔

میرے تھانے کے علاقے کے ایک گاؤں کا نمبردار اور دو آدمی تھانے میں مجھے یہ بتانے آئے کہ ایک کھڈ میں ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔ وہ اس آدمی کو جانتے تھے۔ اُس کا نام آصف ورما تھا۔ کسی پر جنّات کا یا کسی بھی شر شرار یا آسیب کا قبضہ ہو جاتے، آصف ورما جن یا شر شرار کو حاضر کر کے اُسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مشہور تھا کہ اس کے قبضے میں بڑے بڑے خطرناک جنّات ہیں اور ایک ناگ بھی اُس کے قبضے میں ہے جس کی عمر ایک سو سے اُوپر ہو چکی ہے۔ یہ عقیدہ اب بھی موجود ہے کہ جس جن کی عمر ایک سو سال ہو جاتی ہے وہ سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بعض جنّات انسانوں کی شکل اختیار

کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ایسے انسانوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ آنکھ نہیں جھپکتے۔

آصف ورما کے قتل کی رپورٹ دینے والوں نے کہا کہ اسے یقیناً جنات نے مارا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جنات کو قبضے میں رکھنے والا ہر وقت خطرے میں رہتا ہے۔ اُس سے ذرا سی بد پرہیزی یا بے احتیاطی ہو جائے تو جنات اُسے جان سے مار کر اُس کے قبضے سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

اس شخص کے نام کے متعلق بتا دوں۔ ورما ہندوؤں کا نام ہوتا ہے۔ اِس شخص کا نام آصف تھا اور وہ مسلمان تھا لیکن وہ اپنے آپ کو آصف ورما کہلاتا تھا۔ یعنی آدھا مسلمان آدھا ہندو۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی مقبول تھا اس لئے اُس نے اپنا نام دوغلا رکھا تھا کہ وہ ہر مذہب کا آدمی ہے۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی۔

کھوجی کو موقعۂ واردات پر پہنچنے کا پیغام بھیج کر میں نمبردار وغیرہ کے ساتھ لاش دیکھنے چلا گیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا خوبرو آدمی تھا۔ رات گیدڑوں وغیرہ نے دونوں ٹانگوں اور بازوؤں کا بہت سا گوشت کھا لیا تھا۔ چہرہ صحیح تھا۔ میں نے سب سے پہلے لاش کے قریب ارد گرد زمین دیکھی۔ پہلے کبھی آپ کو بتایا تھا کہ قتل کی وارداتوں میں زمین خاموش گواہ ہوتی ہے۔ کھُروں کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے جس سے سراغرسانی میں مدد ملتی ہے۔ مجھے ایسی ایک چیز مل گئی تھی۔ یہ تھی ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے۔ یہ بڑا صاف اشارہ تھا کہ واردات میں عورت شامل تھی۔

جس واردات میں عورت شامل ہو اور دھینگا مشتی ہوئی ہو اور عورت نے کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی ہوں وہاں چوڑیوں کے ٹکڑے ضرور ملیں گے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ عورت کے ساتھ دست درازی یا زیادتی ہوتی ہے۔ وہ مزاحمت کرتی ہے اور ایک دو چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ عورت کو قابو میں لانے کے لئے اُس کے بال پکڑے جاتے ہیں، لہٰذہ وہاں ایک دو بال نوچے ہوئے اور بعض وارداتوں میں بالوں کا گچھا مل جاتا ہے۔

اس واردات میں عورت کی موجودگی پائی گئی تھی۔ کھوجی جلدی پہنچ گیا اور



اُس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہاں کھُرے ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہ تھا کیونکہ یہ راستہ عام نہیں تھا۔ وہ جگہ اس طرح تھی کہ گہرائی میں چلی گئی تھی۔ اس میں سے برساتی نالہ گزرتا تھا جس کے کنارے کے ساتھ ذرا ذرا سا پانی بہہ رہا تھا۔ کنارے پر پانچ چھ گز چوڑی خالی جگہ تھی۔ آگے مٹی کا سیدھا کھڑا ٹیلہ تھا جس میں سے گھاٹی اُوپر چڑھتی تھی۔ اُوپر کٹی پھٹی زمین تھی جس میں سے راستہ آگے ایک گاؤں کو جاتا تھا لیکن اِدھر سے لوگ نہیں گزرتے تھے کیونکہ عام راستہ دوسری طرف تھا جو کشادہ پگڈنڈی تھی۔

جہاں سے گھاٹی اُوپر چڑھتی تھی اس کے ساتھ ہی ٹیلے میں گز ڈیڑھ گز چوڑا شگاف تھا۔ شگاف کے اندر جاؤ تو کنوئیں کی طرح کھڈ تھا۔ اوپر کناروں پر خشک جھاڑیاں تھیں۔ یہ کھڈ ایک ڈھکی چھپی جگہ تھی۔ کھُرے نمبردار اور اس کے ساتھ کے دو آدمیوں نے مٹا دیتے تھے اور ان کھُروں پر گیدڑوں اور اُود بلاؤ کے پنجوں کے بھی نشان تھے لیکن کھوجی نے وہاں سے تھوڑی دُور مقتول اور ایک عورت کے کھُرے ڈھونڈ لئے۔

## جنات کی کارستانی

عورت برساتی نالے کی طرف سے آئی تھی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ دیہاتی لوگ تھے۔ عورت نے سینڈل یا شہری فیشن کے زنانہ چپل نہیں پہن رکھے تھے۔ اُس کے پاؤں میں گاؤں کے موچی کی بنائی ہوئی جُوتی تھی۔ کھوجی زنانہ اور مردانہ کھُرا پہچان لیا کرتے تھے۔ کھُروں کے مطابق یہ عورت اکیلی آرہی تھی اور برساتی نالہ پار کر کے اس کھڈ، یا ٹیلے کے شگاف کے قریب پہنچی۔ مقتول ٹیلے کے ساتھ ساتھ آیا۔ اُس کا کھُرا آسانی سے پہچانا گیا کیونکہ جُوتی لاش کے ساتھ تھی جو کھوجی نے اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ عورت کے کھُرے گھاٹی کے اُوپر نظر آتے۔ کچھ دُور تک ملے۔ آگے پگڈنڈی آگئی اور کھُرے مویشیوں نے مٹا ڈالے۔

میں نے مقتول کی لاش کو اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھا۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے نہیں تھے۔ گردن پر صاف نیلے نشان تھے۔ اسے ہاتھوں سے گلا دبا کر مارا گیا تھا۔ اُس کا کوئی کپڑا اُترا ہُوا نہیں تھا۔ میری رائے یہ تھی کہ اس نے بدی کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ لاش کے اردگرد زمین کچی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ دھینگا مُشتی ہوئی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ عورت نے اپنی عزت بچانے کے لئے مزاحمت کی ہے۔ یہ تو قدرتی امر تھا کہ اس کھڈ میں اگر عورت تھی تو اُسے بُرے مقصد کے لئے لایا یا یہاں روکا گیا ہو گا۔

یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ قتل کا باعث عورت ہے۔ سوال یہ تھا کہ عورت کے ساتھ کون تھا یا کون آ گیا تھا جس نے مقتول کو قتل کیا اور عورت کو بچا کر لے گیا۔ یہ سوال بھی پیدا ہُوا کہ اُس نے عورت کو بچایا ہو گا یا اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا ہو گا؟

لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کیا۔ مقتول کا گاؤں وہاں سے تقریباً ایک میل دُور تھا۔ اُس کے گھر والوں کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ نمبردار نے جو سکھ تھا اور اس کے ساتھ کے دونوں آدمیوں نے جن میں سے ایک ہندو اور ایک مسلمان تھا، مجھے کہا کہ آپ پولیس کے افسر ہیں۔ ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں لیکن ہم اب بھی آپ کو یہی مشورہ دیں گے کہ اس واردات پر مٹی ڈالیں۔ یہ جنوں کی کارستانی ہے۔ مسلمان نے مجھے چند سال پُرانے ایک قتل کی کہانی سُنا دی اور آخر میں کہا کہ تھانیدار کو بہت پریشانی اُٹھانی پڑی۔ آخر انگریز پولیس کپتان نے آ کر حکم دیا کہ تفتیش روک دو۔ یہ قتل جنات نے کیا ہے اور ہم جنات کو نہیں پکڑ سکتے۔

میں نے اس کہانی کی تردید نہ کی۔ یہ لوگ سُنی سنائی اور من گھڑت قصوں کو سچ مانا کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئی تھانیدار تفتیش سے جان چھڑانے کے لئے مشہور کر دے کہ یہ جنوں کی واردات ہے، انگریز افسر ایسی بے بنیاد بات سوچا بھی نہیں کرتے تھے۔ قتل اور ڈاکے کی وارداتوں کی تفتیش میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے۔



میں لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا کر مقتول کے گاؤں چلا گیا۔ مقتول کی بیوی سے ملا۔ اس کی اولاد صرف دو بچیاں تھیں۔ عمریں بارہ اور چودہ سال ہوں گی۔ بیوی کو جب بتایا کہ اُس کا خاوند قتل ہو گیا ہے تو اُس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اُسے حقیقت کو قبول کرنے میں کچھ دیر لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے خاوند کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ اُس نے کسی پر بھی شک نہ کیا۔ اُس سے میں نے بہت کچھ پوچھا۔ یہی پتہ چلا کہ مقتول کے پاس زیادہ تر عورتیں آیا کرتی تھیں۔ جنات کا قبضہ زیادہ تر عورتوں پر ہوا کرتا تھا۔ مقتول جن نکالنے کے علاوہ مرادیں پوری ہونے کے تعویذ اور نقش دیا کرتا تھا۔ بیوی کے ساتھ اُس کی اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اُس کے پاس آنے والی عورتوں کی باتیں اُسے سناتا۔ بیوی کو اُس نے غلام بنا کے رکھا ہُوا تھا۔

"کیا تمہیں یقین تھا کہ تمہارے خاوند کے قبضے میں جن تھے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"میں نے کبھی جن دیکھا نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "یہ اُس کا آبائی پیشہ تھا۔ اُس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا"۔

"رات کو بھی اُس کے پاس عورتیں آتی ہوں گی؟"

"یہاں دن رات ایک جیسے ہوتے تھے"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "اُس کا کمرہ الگ ہے۔ اندر سے دروازہ بند رہتا تھا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، میں کیا کہوں"۔

وہ کچھ نہ بتا سکی۔ یہ معلوم کرنا بیکار تھا کہ یہاں کون کون سی عورت آتی تھی۔ آج کل علم کی روشنی دیہات میں پہنچ گئی ہے لیکن آصف در ما جیسے عاملوں اور پیروں کو لوگ پہلے کی طرح مانتے ہیں اور اپنی عورتوں کو اُن کے پاس بھیج کر آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہیں۔ وہ تو پسماندگی کا زمانہ تھا۔

مقتول کے گاؤں کا نمبردار بھی مجھے نہ بتا سکا کہ مقتول کی دشمنی کسی سے تھی یا نہیں۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ وہ ہندو اور سکھوں میں بھی مقبول تھا۔ اس

گاؤں میں بھی مجھے کہا گیا کہ مقتول کو جنّات نے مارا ہے اور یہ کہ میں اس کام میں نہ پڑوں۔ میں ایسی اندھی عقیدت پر ذرا سا بھی حیران نہ ہُوا۔ میں نے اِن لوگوں سے کچھ بھی نہ کہا۔ نمبردار، ذیلدار اور چوکیدار سے کہا کہ وہ اسے ایک عام آدمی کا قتل سمجھ کر اپنا وہی کام کریں جو وہ کیا کرتے ہیں اور مجھے تھانے میں اطلاعیں دیتے رہیں۔ میرا مطلب مُخبری سے تھا۔

مقتول کی بیوی سے میں نے پوچھا تھا کہ مقتول گھر سے کس وقت نکلا تھا اور گھر کیا بتا گیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے نکلا تھا اور کچھ بتا کر نہیں گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی، نہ اُس کے پاس کوئی عورت آتی تھی۔

## وہ پھندے میں آگیا

تھانے میں جاکر میں سوچنے لگا کہ قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا کہ یہ قتل جنّات نے کیا ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھا کہ آصف ورما نے کسی عورت پر دست درازی کی اور کسی خاوند یا بھائی نے اُسے قتل کر دیا۔ یہ خیال بھی آیا کہ اس شخص کو کھڈ میں جاکر کسی عورت پر دست درازی کی کیا پڑی تھی۔ اچھی سے اچھی عورت اس کے گھر میں آجاتی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ کسی پر جن کا قبضہ ہو جاتے تو مقتول کو گھر بلایا جاتا تھا۔ آپ نے شاید دیکھا ہو گا کہ کسی عورت پر جن نکالنے والا گھر والوں کو یہ کہہ کر باہر نکال دیتا ہے کہ وہ دروازے بند کر کے جن کی خبر لے گا۔ گھر والے بڑی خوشی سے اپنی عورت کو عامل کے ساتھ کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔ مقتول بھی ایسا ہی عامل تھا۔

میرے لئے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ میرے علاقے کی کون کون سی عورت پر جنّات کا قبضہ ہے اور مقتول کس کس کے گھر جاتا ہے مگر میں نہیں مان سکتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں قتل ہُوا ہے۔ مجھے ایک بات سمجھ میں آتی تھی۔ وہ



کسی عورت کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اپنے گھر کو جا رہا ہو گا۔ اس کھڈ کے قریب اُسے رہزن یا کوئی پیشہ ور ڈاکو مل گئے۔ عورت جوان اور خوبصورت ہو گی۔ وہ اُسے زبردستی کھڈ میں لے گئے ہوں گے جہاں عورت نے بھی مقابلہ کیا اور آصف ورما نے بھی۔ اس کوشش میں آصف ورما مارا گیا اور ڈاکوؤں نے عورت کو اپنے ساتھ لے جانا بہتر سمجھا ہو گا۔

میں نے اپنے تھانے کے علاقے کے نمبرداروں وغیرہ کو تھانے حاضری دینے کے لئے پیغام بھیجا۔ پہلے بھی میں نے شاید کسی کہانی میں بتایا تھا کہ نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش سرکاری آدمی ہُوا کرتے تھے۔ یہ پولیس کے بڑے کارآمد مددگار ہُوا کرتے تھے مگر کسی مجرم پر پردہ ڈالنا چاہتے تو تھانیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک دیا کرتے تھے۔ بعض کیسوں میں تو ان کے ساتھ سودا بازی تک نوبت آجاتی تھی لیکن اُن کے ہاتھوں میں صرف وہ تھانیدار بے بس ہُوا کرتے تھے جو کھانے پینے کے عادی تھے۔ ایسے تھانیداروں کی دُکھتی رگیں ان نمبرداروں وغیرہ کے ہاتھ میں ہوتی تھیں۔

آصف ورما کے قتل کے کیس میں مجھے یہی خدشہ نظر آ رہا تھا کہ متعلقہ نمبردار گڑبڑ کرے گا۔ اس کی کوئی وجہ ہو نہ ہو، یہ وجہ سامنے نظر آ رہی تھی کہ سب اسے جنّات کی واردات کہہ رہے تھے کہ میں نے جنّات کی توہین کر دی تو وہ گاؤں کو نقصان پہنچائیں گے۔ وہ سب مقتول کے معتقد تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں انہی میں سے اُس کا کوئی دشمن نکال لیتا۔

میں ذہن پر زور دیتا رہا۔ اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ کے جو ہندو راجپوت تھا، خیالات مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ اس سے مجھے سوچنے میں کچھ مدد مل گئی۔ میں چونکہ ان عاملوں اور پیروں اور گدّی نشینوں کی پُراسرار دُنیا سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے مجھے خیال آیا کہ مقتول کی دشمنی اسی کے پیشے کے کسی آدمی کے ساتھ ہو گی اور جھگڑا عورت پر ہو گا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ اس عورت، جس کی چوڑیوں کے ٹکڑے میرے پاس تھے، دام میں دانے

کے طور پر استعمال کیا گیا ہوگا۔ یعنی آصف ورما کو گھر سے باہر پھندے میں لانے کے لئے اس عورت کو بھیجا گیا اور وہ پھندے میں آگیا۔ اُس نے اس عورت کے ساتھ دست درازی کی، اتنے میں اس کے دشمن آگئے۔ اُنہوں نے کلہاڑیوں وغیرہ سے قتل کرنے کی بجائے اس کا گلا دبانا شاید اس لئے مناسب سمجھا کہ یہ تاثر پیدا ہو کہ اسے جنات نے مارا ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ ملی۔ مقتول کا گلا دبایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق مقتول کو مرے سولہ گھنٹے گزر گئے تھے۔ یہ اندازہ ہُوا کرتا ہے۔ ایک گھنٹہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مطابق مقتول رات کو نہیں بلکہ سورج غروب ہونے کے وقت کے لگ بھگ قتل ہُوا تھا۔

اُس کے گاؤں کے لوگ لاش لینے آئے ہوئے تھے۔ میں اُن سے پوچھتا رہا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس علاقے میں ایک پیر بھی ہے جو شاہ قلندر ہجویری کے نام سے مشہور ہے۔ گاؤں کے ان آدمیوں سے کریدنے پر پتہ چلا کہ مقتول شاہ قلندر کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ شاہ قلندر کے قبضے میں کوئی جن نہیں۔ میں نے شاہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نام سُنا تھا۔

مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے مقتول کا ایک دشمن مل گیا ہو۔

## ساری رات عیش کراؤں گا

میں رات کو کھانا کھا کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور شاہ قلندر کے گاؤں چلا گیا۔ میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ گاؤں میرے تھانے سے تقریباً تین میل دُور تھا۔ شاہ قلندر تین چار مریدوں میں بیٹھا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ شراب چڑھی ہوئی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ میں کون ہوں۔ اُس نے مسکرا کر اور بے نیازی سے گاؤ تکیے پر نیم دراز رہتے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مریدوں کی طرح اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر



چُوما اور آنکھوں سے لگایا اور اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ تھانیدار کو اپنے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر اُس کے نشے میں خمار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں جو پُوری کھلی ہوتی تھیں، اُدھ کھلی ہو گئیں۔

"سرکار!" — میں نے اُسے مظلوموں کے لہجے میں کہا — "بڑی مشکل میں گرفتار ہو کے آیا ہوں۔ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کے اشارے پر سب باہر چلے گئے۔ میرا کانسٹیبل جمیل الدین میرے پاس بیٹھا رہا۔ شاہ قلندر نے مخمور آواز میں کہا کہ میں بات کروں۔

"آصف ورما قتل ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "مجھے بتایا جا رہا ہے کہ اُسے جنوں نے قتل کیا ہے۔ میری نوکری کا سوال ہے سرکار! انگریز ہمارے جنوں کو نہیں مانتے۔ آپ کے ہاتھ میں جو طاقت ہے وہ اور کسی میں نہیں۔ آپ کے متعلق بہت کچھ سُن کر آیا ہوں۔ مجھے یہ بتائیں کہ اُسے کیا واقعی جنوں نے قتل کیا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں تفتیش سے ہاتھ کھینچ لوں، ورنہ میں بے گناہ لوگوں کو مشتبہ بٹھا کر انہیں مارتا پیٹتا رہوں گا۔"

"اُسے میرے جنوں نے قتل کیا ہے" — شاہ قلندر ہجویری نے کہا — "وہ میرے جنوں کو ورغلا رہا تھا۔ میرے قبضے میں بڑے ظالم جن ہیں آپ اس مردُود کے قتل کی تفتیش چھوڑ دیں ورنہ آپ کو بھی نقصان پہنچے گا۔ میں جانتا ہوں اُسے کون سے جن نے مارا ہے۔"

"کیا وہ جن بیان دے سکتا ہے کہ یہ قتل اُس نے کیا ہے؟" — میں نے کہا — "میں نے تفتیش روکنے کی کوئی وجہ بھی لکھنی ہے ورنہ میرے انگریز افسر کہیں گے کہ میں نے جنّات کا بہانہ بنا کر تفتیش سے جان چھڑائی ہے۔"

میں نے اُس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر التجا کی — "مجھ پر رحم کریں سرکار! اس جن کو حاضر کر کے بیان دلا دیں، ورنہ میں رگڑا جاؤں گا مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اُس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔

"نیک بخت کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا" ـــــ شاہ قلندر نے کہا ـــــ "یہیں ہے۔ کہتا ہے میرے ساتھ بات نہ کرنا۔ اسے (مجھے) کہو یہاں سے چلا جاتے ..... میں بیان دے دیتا ہوں کہ یہ قتل جن نے کیا ہے۔"

میرے ساتھ جمیل الدّین نام کا جو کانسٹیبل تھا وہ ذہین آدمی تھا۔ اُس نے ایسی ایکٹنگ شروع کر دی جیسے سخت خوفزدہ ہو گیا ہو۔ مجھے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا ـــــ "ملک صاحب! آپ کس چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ اپنے ساتھ آپ مجھے بھی مروائیں گے۔ سرکار ٹھیک فرماتے ہیں کہ جن غصّے میں ہے" ـــــ میں بدھو بنا رہا۔

"لیکن کاغذوں میں کیا لکھیں؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "سرکار! ایک زحمت گوارا فرمائیں۔ تھانے میں چل کر بیان دیں یا جن کو یہاں حاضر کر کے بیان دلا دیں۔"

"او احمق انسان!" ـــــ شاہ قلندر نے دھیما سا قہقہہ لگا کر کہا ـــــ "قلندر کا تھانے سے کیا مطلب؟ یہ جن بڑا ظالم ہے۔ اسے ابھی حاضر نہ کرا۔"

"پھر سرکار خود تھانے تشریف لے چلیں" ـــــ میں نے کہا۔

وہ گاؤ تکیے پہ نیم دراز تھا۔ بالکل ہی لیٹ گیا اور انگڑائی لے کر بولا ـــــ "معلوم ہوتا ہے تُو خیریت سے گھر نہیں جانا چاہتا۔ تُو مجھے بھی مروائے گا۔"

میں نے آگے ہو کر شاہ قلندر کی کلائی پر ہاتھ رکھا اور کلائی دبا کر کہا ـــــ "قلندر صاحب! آپ کو تھانے چلنا پڑے گا۔ اگر ضرورت سمجھو تو اپنے جن کو بھی ساتھ لے چلو۔"

اُس نے دبے دبے رُعب سے بھی اور کھسیانی سی ہنس کر بھی مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور اُس نے یہ بھی کہا کہ سارا گاؤں اس کا مرید ہے اور اس پر گاؤں والے جانیں قربان کر دیں گے۔ میں نے اُسے بتایا کہ گاؤں کے باہر میری پوری گارد کھڑی ہے۔ اگر اُس نے تھانے چلنے سے پس و پیش کی تو میں اسے گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔

"سنو قلندر!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں جانتا ہوں تم ہجویری نہیں ہو۔



تم جو کچھ ہو مجھے معلوم ہے۔"

"میں تھانے چلا گیا تو گاؤں میں میری بے عزّتی ہو گی" ـــــ اُس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اور قلندری کے چبوترے سے نیچے اُتر کر ایک عام قسم کے مشتبہ آدمی کی طرح کہا ـــــ "میرا بیان یہیں لے لیں۔ آپ کی بہت خدمت کروں گا۔ جو حکم کریں گے پیش کروں گا۔ ساری رات عیش کراؤں گا۔ جیسی عیش چاہو گے ویسی ہی مہیا کروں گا۔"

"رات کا وقت ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آدھی رات کے بعد میں خود ساتھ آ کر تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ کسی کو خبر نہ ہو گی۔ کسی کو خبر ہو بھی گئی تو کہنا کہ تھانیدار کے گھر جنّات نے گڑبڑ کر دی ہے، انہیں بھگانے گیا تھا۔"

میں اس کوشش میں تھا کہ یہ شخص باتوں سے ہی میرے ساتھ چل پڑے اور مجھے دوسری کارروائی نہ کرنی پڑے۔ بہرحال اُسے میں نے اُٹھا لیا اور ہم چل پڑے۔

## تمہارے جنّات کا بھوت ہوں

تھانے لا کر میں نے اُسے کہا کہ وہ قاتل جن کو حاضر کرے، اور اُسے کہے کہ وہ بیان دے۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں، نہ کوئی جن بیان دینے آئے گا۔ اُس نے کہا کہ وہ خود بیان دے گا۔ میں نے کہا کہ چلو بیان دو۔ اس نے جو بیان دیا وہ اگر میں اُسی کے الفاظ اور اسی کے لہجے اور انداز میں پورے کا پورا آپ کو سناؤں تو یہ بہت ہی دلچسپ ہو گا لیکن کہانی بلاضرورت لمبی ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ اُس نے یہ بیان دیا کہ اُس کے قبضے میں جنّات ہیں۔ آصف ورما اس کے جنّات کو پریشان کرتا تھا۔ آصف کے قبضے میں جو جنّات تھے، وہ نُوری نہیں ناری تھے۔ وہ صرف شیطانی کام کرتے تھے۔ ان سے مقتول نے اُن نُوری جنّات کو پریشان کرایا جو شاہ قلندر کے قبضے میں تھے۔ ان میں مقتول کے شیطان

جنّات نے پھوٹ ڈال دی۔ شاہ قلندر کے دو جن غنڈہ قسم کے تھے جیسے آج کل سیاسی پارٹیوں اور برسرِ اقتدار پارٹی کے پاس ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے آصف ورما کو قتل کر دیا اور شاہ قلندر کو جا کر بتایا کہ مقتول کی لاش فلاں کھڈ میں پڑی ہے۔ ان دونوں کو شاہ قلندر اپنے مؤکل کہتا تھا۔ مؤکل اُن جنّات کو کہتے ہیں جن سے کام لیا جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے شہروں میں پیدا ہونے والی آج کی نسل شاہ قلندر کے اس بیان کو لغو اور افسانوی سمجھتی ہو جیسے یہ الفاظ میں نے خود کہانی کو دلچسپ بنانے کے لئے لکھ دیئے ہوں۔ آپ دیہات میں ان "شاہوں" اور عاملوں کے زیرِ اثر لوگوں میں اُٹھیں بیٹھیں۔ اُن میں جنّات کی کہانیاں سچ مانی جاتی ہیں۔ شاہ اور عامل اپنی اصطلاحوں میں باتیں کرتے ہیں۔ شہروں میں بھی ان کہانیوں کو سچ مانا جاتا ہے۔ کوئی جن کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور کوئی چڑیل کسی مرد پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ دیہات میں ہسٹیریا کو بھی جنّات کا قبضہ کہتے ہیں۔

شاہ قلندر جب مجھے بتا چکا کہ مقتول کو اس کے دو مؤکلوں (جنّوں) نے قتل کیا ہے تو میں نے اُس سے پوچھا ——"ان دونوں نے یا دونوں میں سے ایک نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں، اور اُن کی چوٹیاں زنانہ تھیں؟"

"میں نے اُن سے پوچھا نہیں" —— اُس نے جواب دیا ——"میرا خیال ہے اِن میں سے ایک نے عورت کا روپ دھارا ہوگا اور آصف ورما کو ورغلا کر اُس کھڈ میں لے گیا ہوگا، پھر دوسرا بھی آگیا ہوگا اور دونوں نے آصف کو مار ڈالا۔"

"جناب شاہ قلندر ہجویری صاحب!" —— میں نے اُسے کہا —— "اب اپنے مؤکلوں سے کہو کہ تمہیں مجھ سے چھڑا کر لے جائیں۔ اگر وہ نہیں آتے تو انہیں کہو کہ اقبالِ جرم کریں۔ اگر وہ یہ بھی نہیں کرتے تو تم اقبالِ جرم کرلو قلندر! فائدے میں رہو گے۔"

اُس نے اپنے انداز سے بات کی مگر وہ خود محسوس کر رہا ہوگا کہ



اب اُس کی زبان ہکلا رہی تھی اور اس کے پاؤں کے نیچے زمین ہل رہی تھی۔

"تم نے بہت گناہ کرلئے ہیں قلندر!" —— میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور کہا ——"تم نے لوگوں کی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کی عزّت پر بہت عیش کرلی ہے۔ اب تمہارے حساب کا وقت آگیا ہے۔ کل تک مجھے پتہ چل جائے گا کہ تمہاری کون کون سی مریدنی مقتول کے قبضے میں چلی گئی تھی اور تمہارے روپے پیسے والے کتنے سائلوں کو مقتول نے ورغلا لیا تھا۔ کیا تم مجھے اُلو سمجھتے ہو کہ میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ تم دونوں میں کاروباری رقابت اور حسد تھا؟ ..... میں تمہارے جنّات کا بھوت ہوں۔ اپنی زبان سے بتا دو تو پھانسی سے بچا لوں گا۔ اب اپنی فریب کاری کو ذہن سے نکال دو۔ یہ تھانہ ہے۔ یہاں ہتھکڑیاں اور حوالات ہے۔ جن یہاں نہیں آسکتے۔ سچ بتا دو اندر خانے کیا ہوا اور تم نے آصف ورما کو کس طرح قتل کیا یا کرایا ہے۔ اب جنّوں اور مؤکلوں کا نام نہ لینا۔"

## عورت، عامل اور جنّات

اُس نے وہی حرکت کی جو اکثر مشتبہ اور ملزم تھانے میں آکر کیا کرتے ہیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا ——"مجھ پر اعتبار کریں۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ باقی سب باتیں سچ ہیں۔"

"کون سی باتیں؟"

"جن نہ کوئی میرے قبضے میں ہے نہ کوئی مقتول کے قبضے میں تھا" —— اُس نے کہا ——"کاروبار دونوں کا اچھا چل رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں جنگل میں ایک ہی شیر رہ سکتا ہے۔ ہماری آپس میں کاروباری دشمنی تھی لیکن میں نے اُسے قتل نہیں کرایا۔"

"تم نے قتل کرایا ہے قلندر!" —— میں نے کہا ——"اب تم اپنے گھر نہیں جاسکو گے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے خلاف تمہارے اپنے

بھیانک اور مکروہ گناہوں کی کیسی کیسی شہادت تمہارے سامنے آتے گی۔ تمہارے گناہ جنات کی طرح تمہارے آگے پیچھے ناچیں گے۔ اُس وقت میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ اُس وقت پھانسی کا پھندا ہوگا جس سے میں تمہاری گردن نہیں نکال سکوں گا۔"

"اگر آپ مجھے آزاد کر دیں تو میں قاتل کا سراغ لگا دوں گا"—اُس نے کہا—"آپ شہادت لے آئیں۔ آپ کو ایسی کوئی شہادت نہیں ملے گی کہ میں نے اُسے قتل کیا یا کرایا ہے۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔"

اُس نے جب اپنے انداز اور اپنی زبان سے قلندری اور "شاہ پن" کا بہروپ اُتارا تو میں نے نوٹ کیا کہ وہ ذہین اور عقلمند آدمی ہے اور اُس کی باتوں میں ایسا تاثر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے فراڈ انسان ہوتے ہی ذہین اور گھاگ ہیں۔ اُن کا کاروبار اس استادی میں مہارت حاصل کئے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔

"تمہیں کس نے اور کس وقت بتایا تھا کہ آصف ورما قتل ہو گیا ہے؟"

"دوپہر کو سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی تھی کہ اُستوری کا ورما مارا گیا ہے"—اُس نے جواب دیا—"اور لوگوں نے یہ کہنا بھی شروع کر دیا تھا کہ اُسے جنوں نے مارا ہوگا۔ میں آپ کو سچ بات بتا دوں۔ میں نے اپنے مریدوں کے ذریعے مشہور کر دیا کہ اُسے میرے جنوں نے ہلاک کیا ہے۔ اب میرے گاؤں میں جا کر لوگوں کی باتیں سُنیں۔ وہ کہہ رہے ہوں گے کہ شاہ قلندر جنات کا بادشاہ ہے۔ جب آپ میرے گھر آتے تھے، مجھے پتہ چل چکا تھا کہ آصف ورما قتل ہو گیا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی میں نے ایسی ہی باتیں کیں۔ ان سے آپ کو شک ہو گیا کہ قاتل میں ہوں ..... نہ حضور! آپ میری قسموں پر اعتبار نہیں کریں گے۔ آپ شہادتیں اکٹھی کریں۔ آپ کو میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔"

اُس نے مجھے بہت سی دلیلیں دے کر اپنے آپ کو بے گناہ



ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اب وہ منت سماجت اور التجا کے لہجے میں بات نہیں کر رہا تھا بلکہ اُس کی آواز میں پختگی اور خود اعتمادی تھی۔ وہ زبان کا جادو چلانا جانتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل یہی ہے لیکن اُس نے میرے یقین کو شک میں بدلنے کی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ میں اُس پر جرح کرتا جا رہا تھا۔ اُس کی ہر بات سے میں کئی سوال پیدا کر لیتا تھا لیکن وہ ہر سوال کا جواب ایسے انداز سے دیتا تھا جو مجھ پر اثر کرتا تھا۔ اس کے باوجود میں اُسے قتل کے الزام سے بری نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ مشتبہ نمبر ایک تھا۔

اُس نے اپنے کاروبار کے راز بتانے شروع کر دیئے۔ اُس نے کہا کہ جن بھوت ہوتے ہوں گے لیکن اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں۔ ذرا غور کریں کہ وہ اَن پڑھ آدمی تھا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نفسیات بھی کوئی علم ہوتا ہے لیکن اُس کی بات علمِ نفسیات پر پوری اُترتی تھی۔

کہنے لگا کہ یہ تو سب کا عقیدہ ہے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں اس لئے اُس کی بے معنی بات کا بھی اُن پر جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں کو ہسٹیریا اور مرگی کے دورے پڑتے ہیں لیکن وہ اور اس جیسے عامل اور پیر ان دوروں کو جنات کا قبضہ یا آسیب کہتے ہیں۔

"آپ تھانیدار ہیں اس لئے آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ انسانوں کو پڑھ سکتے ہیں اور چہرے سے بتا دیتے ہیں کہ یہ شخص مجرم ہے یا بے گناہ"—اُس نے کہا—"لیکن آپ عورت کا چہرہ دیکھ کر اُس کے دل کی بات نہیں بتا سکتے۔ میں آپ کو کئی عورتیں دکھا سکتا ہوں جن پر جنوں کا سایہ یا قبضہ ہے۔ اُن پر جب یہ دورہ پڑتا ہے تو بڑے بڑے جوانمرد اور دلیر آدمی گھبرا جاتے ہیں مگر ان عورتوں پر نہ کسی جن کا قبضہ ہوتا ہے نہ آسیب ہوتا ہے۔ وہ ڈھونگ ہوتا ہے۔ عورت ایسی شکل بنا لیتی ہے اور ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں کرتی ہے کہ بعض اوقات تجربہ کار عامل بھی دھوکے میں آجاتے ہیں۔"

میں نے ایسی باتیں پہلے بھی سُن رکھی تھیں۔ اب اس خفیہ دنیا کا ایک اہم کردار مجھے راز کی کچھ نئی باتیں بتا رہا تھا۔

"ایسی عورتیں کسی عامل کو یا مجھ جیسے کسی پیر یا مولوی کو اپنے راز میں شامل کر لیتی ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "وہ اس ڈھونگ کو اور زیادہ پکّا کر دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت کو ہم اپنے خلاف بات نہیں کرنے دیتے۔ جب عورت برداشت کرتے کرتے تنگ آجاتی ہے تو اس قسم کے ڈھونگ رچانے پر اُتر آتی ہے۔ وہ جن کی زبان میں بولتی ہے۔ ایسی عورت پر مصیبت یہ نازل ہوتی ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے اور اس کے دل میں خاوند کے خلاف نفرت ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ عورت خاوند کو ہی چاہتی ہے مگر خاوند کسی وجہ سے اُس کی جذباتی تسکین سے معذور ہے۔ اس صورت میں عورت اگر چالاک ہو تو وہ اپنے اُوپر جنّات کا دَورہ طاری کر لیتی ہے۔ اگر سیدھی سادی ہے تو خون کے جوش سے اس پر واقعی دَورے پڑنے لگتے ہیں۔ اسے ہم جن اور آسیب کہتے ہیں لیکن اصل میں یہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی مجھ جیسے بہت کام دکھاتے ہیں۔ اُس کے گھر والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ عامل یا پیر اسے بند کمرے میں اپنے ساتھ رکھتا ہے یا کسی 'خاص' عمل کے لئے اسے تنہا اپنے گھر بلاتا ہے۔ لوگ اتنے جاہل ہیں کہ اس 'علاج' کا ذکر فخر سے کرتے ہیں ....

"اس کے علاوہ اور بھی کچھ وجوہات ہوتی ہیں جو عورت پر جھُوٹ موٹ کا جن طاری کر دیتی ہیں۔ بعض عورتوں کی فطرت میں فتنہ اور فساد ہوتا ہے۔ انہیں جھوٹ بول کر فساد پھیلانے میں لطف محسوس ہوتا ہے۔ انہیں گھر والوں اور خاوندوں سے سرزنش ہوتی ہے مگر وہ معصوم بنی رہتی ہیں۔ پھر اُن کی پٹائی ہوتی ہے۔ وہ ہمدردی سے محروم ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض عورتیں اپنے اُوپر جنّوں کے قبضے کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔ ایسی عورتیں عاملوں اور روحانی معالجوں کو بھی اصل حقیقت نہیں بتاتیں اور سب کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ واقعی جنّات ہیں۔"

شاہ قلندر نے وہ طریقہ بتایا جس سے وہ علاج کرتے ہیں۔ وہ الفاظ اور اصطلاحیں تو اپنی استعمال کر رہا تھا لیکن وہ ہپناٹزم کی بات کر رہا تھا۔



وہ ہپناٹزم کے لفظ سے ناواقف تھا۔ وہ باتوں سے، سنسنی خیز روایتوں اور حکایتوں سے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے 'شکار' کو ہپناٹائز کر لیا کرتا تھا۔ اُس نے کہا کہ اندھا یقین لوگوں کو اُن کے جال میں پھنسائے رکھتا ہے اور جن لوگوں کا کام نہیں ہوتا وہ بھی اپنے آپ کو دھوکہ دے لیتے ہیں کہ اُن کا کام ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس نے مجھ سے جان چھڑانے کے لئے مجھے اپنا اور اپنے جیسے تمام عاملوں کا فراڈ سنا دیا۔ یہ فراڈ آج بھی اُسی طرح چل رہا ہے۔ پاکستان میں تعلیم اور روپیہ عام ہو جانے سے اور سائنس کی ترقی سے اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میں نے پڑھے لکھے لوگوں کو جنّات کے فراڈ کو سچ مانتے دیکھا ہے۔

## بچّوں سے عزّت پیاری

میں ابھی اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہُوا تھا۔ اُس کی زبان کا جادو دیکھ کر مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ مجھے انگلیوں پر نچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اس واردات میں عامل نہ ہوتا، وہ کوئی عام آدمی ہوتا تو میں اب تک قاتل کے قریب پہنچ چکا ہوتا۔ عامل نے جو پیچیدگی پیدا کر دی تھی وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ میں نے شاہ قلندر سے کہا کہ وہ اگر قاتل نہیں ہے تو سوچے اور مجھے بتائے کہ قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے اور قاتل کون ہوگا۔

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم اور مقتول جیسے استاد کسی عورت پر ہاتھ رکھیں تو وہ تمہیں قتل کرنے پر آجاتے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم ان دیہاتی عورتوں کے آقا ہو۔"

"نہ ملک صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں نے آپ سے کہا ہے نا، کہ آپ عورت کا چہرہ دیکھ کر نہیں بتا سکتے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ عورت کو ہم سمجھتے ہیں۔ آپ ایسا خیال دماغ سے نکال دیں کہ ہر عورت اتنی کچّی اور ایسی موم ہوتی ہے کہ ہم اُسے اپنے قبضے میں کر لیں۔ یہ تو عورتوں کی خاص

قسم ہے جو ہمارے جال میں آتی ہے۔ ہر عورت بلکہ زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جو اپنی عزت پر اپنے بچے قربان کر دیا کرتی ہیں۔ یہ بات مجھے ایک عورت نے کہی تھی۔ بہت عرصے کی بات ہے۔ ایک بڑی خوبصورت عورت میرے پاس آئی۔ اُس کی گود میں سات آٹھ ماہ کا بچہ تھا جو سُوکھ گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس نے قبرستان میں کسی قبر کی توہین کی ہے۔ میں نے اُسے تعویذ دیتے اور دو تین بار بلایا۔ وہ آتی رہی۔ میں نے اُس پر اپنی نیّت کی شیطانی کا اظہار کیا تو وہ غصّے میں آگئی اور نفرت سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے ناراض کر دو گی تو تمہارا یہ بچہ زندہ نہیں رہے گا۔ اُس نے کہا — "میں ایسے کئی بچے پیدا کر لوں گی۔ ابھی جوان ہوں، لیکن عزّت ہاتھ سے گئی ہوتی واپس نہیں ملے گی۔ میرے خاوند کو مجھ پر بھروسہ ہے، اسی لئے وہ میرے ساتھ نہیں آتا" — وہ مجھ پر لعنت بھیج کر اور میرے تعویذ جو اُس کے بچے کے گلے میں پڑے ہوتے تھے، اتار کر اور میرے آگے پھینک کر چلی گئی۔ وہ ساتھ والے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میں اُس کے بچے کے متعلق پتہ کرواتا رہا۔ ایک سال بعد اُس کا بچہ کسی سیانے کی دوائی سے صحت یاب ہو گیا۔"

اُس کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ مجھے رات گزرنے کا خیال نہ رہا اور کچھ دیر تو میرے ذہن سے یہ بھی اتر گیا کہ میں قتل کی ایک واردات کی تفتیش کر رہا ہوں۔

وہ کہہ رہا تھا — "بعض گھروں کے مرد بے غیرت ہو جاتے ہیں لیکن عورت غیرت کا دامن نہیں چھوڑتی۔ آپ نے ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آصف ورما کسی غیرت والی عورت پر ہاتھ ڈال بیٹھا ہوگا۔ کوئی عورت اپنی عزت بچانے کے لئے مقابلے پر آجاتے تو مجھ اور آپ جیسے مرد یہی کرتے ہیں کہ اُسے جان سے مار ڈالیں۔ اُس کی عزّت کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ شاہ قلندر کو میں نے جانے نہ دیا۔ اس کے لئے ناشتہ منگوایا اور خود گھر جا کر سو گیا۔ مسلسل چار گھنٹے گہری نیند سو کر دماغ ٹھکانے آ



گیا۔ تھانے میں آیا تو شاہ قلندر رات والے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ دو گاؤں کے نمبردار آتے ہوتے تھے۔ میں نے شاہ قلندر کو نہ جگایا۔ نمبرداروں سے رپورٹیں لینے لگا۔

## بڑی تیز لڑکی، دل کی بڑی مضبوط

ان نمبرداروں نے بتایا کہ کتنی عورتوں پر جنّات کا قبضہ ہے اور کون کس کے زیرِ علاج تھی اور کون شاہ قلندر کے زیرِ علاج۔ ایک نمبردار نے بتایا کہ اُس کے گاؤں کی ایک بڑی خوبصورت مسلمان لڑکی ناجو کی شادی ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ کوئی ایک مہینے سے اُسے دَورے پڑ رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ مڑ جاتے تھے اور وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے ایسا اچھلتی کہ فرش پر آپڑتی تھی۔ اپنے بال نوچتی اور چیخیں مارتی تھی۔ بزرگوں نے کہا کہ شاہ قلندر ہجویری کو بلاؤ۔ یہ جن ہے۔ شاہ قلندر کو بلایا گیا۔ اُس نے ناجو کو دیکھ کر کہا کہ مُنہ زور جن ہے۔ اُس نے اپنا کوئی عمل کیا جس سے جن بول پڑا۔ جن نے کہا کہ یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ میں اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ شاہ قلندر نے اُسے الگ کر دیا اور ناجو سے کہا کہ وہ اس کے گھر آیا کرے۔

شاہ قلندر کا گاؤں ناجو کے گاؤں سے ڈیڑھ میل دُور تھا۔ ناجو تین چار بار شاہ قلندر کے پاس گئی مگر جن نہ نکلا۔ ایک روز لڑکی کو اتنا سخت دَورہ پڑا کہ گھر والے گھبرا گئے۔ جن نے گھر میں طوفان بپا کر دیا۔ شاہ قلندر کو لانے کے لئے گھوڑی بھیجی گئی۔ شاہ آیا تو اُسے دیکھتے ہی ناجو نے (بلکہ جن نے) ہنگامہ بپا کر دیا۔ دراصل جن بول رہا تھا۔ اس نے شاہ قلندر سے کہا — "چلا جا یہاں سے ... میرے پیر اُستاد آصف ورما کو بلاؤ۔ وہ نہیں آتے گا تو میں نہیں جاؤں گا۔"

شاہ قلندر غصّے میں چلا گیا اور وہ آصف ورما کو بلا لائے۔ اُسے دیکھ کر جن ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس نے کہا — "میرے پیر اُستاد! میں اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے آپ کی اجازت چاہیئے" — آصف ورما نے اسے کہا کہ

یہ تو شادی شدہ ہے۔ تم اتنے نیک پاک جن ہو۔ یہ گناہ نہ کرو۔ جن نے کہا — اسے اس خاوند سے طلاق دلا دو۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

آصف ورما نے سب سے کہا کہ باہر نکل جائیں۔ وہ ناجو کے ساتھ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہاں گاؤں کی عورتیں اور مرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ نمبردار بھی وہیں تھا۔ اُس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد آصف ورما نے دروازہ کھولا۔ دیکھا ناجو آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ آصف ورما نے کہا کہ جن چلا گیا ہے لیکن پھر آئے گا۔ جب آئے آصف ورما کو بلا لیا جائے۔ اس کا گاؤں ایک میل دُور تھا۔

تین چار بار لڑکی کو ایسے دَورے پڑتے رہے اور آصف ورما آتا رہا۔ اب جن نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس لڑکی کو اس کا خاوند طلاق دے دے ورنہ وہ اس کے خاوند کو ساری عمر کے لئے کوڑھی کر دے گا۔ آصف ورما ہر بار ایسے ہی کرتا کہ سب کو باہر نکال کر لڑکی کے ساتھ اکیلا رہ جاتا اور اندر سے دروازہ بند کر لیتا۔ اُس نے ناجو کے والدین اور اُس کے خاوند کے والدین سے کہا کہ جن نے شرط بڑی سخت بتائی ہے۔ کہتا ہے کہ خاوند ناجو کو طلاق دے دے۔ آصف ورما نے بتایا کہ اس نے جن کو اس پر راضی کر لیا ہے کہ لڑکی کو خاوند طلاق دے دے گا لیکن لڑکی جوان ہے، اس کی کہیں اور شادی ہونی چاہیئے۔ جن نے مان لیا ہے لیکن کہتا ہے کہ اس کا فیصلہ وہ خود کرے گا کہ شادی کس کے ساتھ ہو۔ جن کہتا ہے کہ وہ اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ ناجو کی شادی کرائے گا۔

یہ شرط سُن کر ناجو کے والدین اور سُسرال بہت پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے آصف ورما سے کہا کہ وہ جن سے کہیں کہ کوئی اور شرط بتائے۔ آصف ورما نے انہیں کہا کہ وہ بڑا زبردست جن ہے۔ وہ بڑی مشکل سے مانا ہے۔ اگر اس کی یہ شرط پوری نہ ہوئی تو سب کو نقصان پہنچائے گا۔ آصف ورما نے انہیں کہا کہ وہ کچھ دن سوچ لیں۔ وہ جن سے مہلت لے لے گا۔



لڑکی اُٹھ کر چلنے پھرنے لگی۔ تیسرے چوتھے دن پتہ چلا کہ آصف ورما کی لاش کھڈ میں پڑی ہے۔ سارے گاؤں پر خوف طاری ہو گیا۔ ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ آصف ورما کو اسی جن نے مارا ہے۔ اب ناجو کے والدین اور اس کے سُسرال سوچ رہے ہیں کہ خاوند اسے طلاق دے دے، ورنہ جن انہیں بھی نہ جانے کیسی سزا دے گا۔

"خاوند کیسا ہے؟" — میں نے نمبردار سے پوچھا۔

"جتنی لڑکی خوبصورت ہے، خاوند اتنا ہی بدصورت ہے" — نمبردار نے کہا — "کالے رنگ کا دُبلا پتلا مریض سا آدمی ہے۔"

"یعنی یہ بے جوڑ شادی ہے" — میں نے کہا۔

"برادریوں میں جوڑ نہیں ملاتے جاتے" — نمبردار نے کہا — "رشتے برادریوں کے بزرگ طے کرتے ہیں۔ لڑکی تندرست اور بھرپور جوان ہے اور خاوند چُپ چاپ اور مریل سا ہے۔"

میرے دماغ میں ایک خیال آ گیا۔ میں نے نمبردار سے کہا — "اگر تم جانتے ہو تو بتا دو یا گاؤں سے معلوم کرو کہ وہ کسی اور آدمی کو پسند کرتی ہو گی۔"

"گاؤں میں کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی" — اُس نے کہا — "مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک بڑے خوبصورت جوان کے ساتھ ناجو کا یارانہ ہے لیکن اتنا کھلا نہیں کہ کوئی انہیں پکڑ سکے۔ عورتوں نے انہیں دو تین بار کہیں اکٹھے دیکھا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس آدمی کی شادی طے ہو چکی تھی جو اُس نے رکوا دی ہے۔ منہ زور جوان ہے اور ماں باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔"

"لڑکی گاؤں کی عام لڑکیوں کی طرح سیدھی سادی ہے؟"

"نہ جی!" — نمبردار نے جواب دیا — "بڑی تیز لڑکی ہے۔ دل کی بڑی مضبوط ہے۔ اپنی کرنے والی ہے .... میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ گاؤں کے بڑے نامی گرامی جوانمردوں نے اُس پر سونے چاندی کے

جال پھینکے ہیں لیکن وہ ایسی نڈر ہے کہ بھرے گاؤں میں کھڑی ہو کر کھری کھری سنا دیتی ہے۔"

ناجو کے متعلق یہ اطلاع میرے کام آسکتی تھی لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اُس شخص کی قاتل کس طرح ہو سکتی ہے جس کی وہ معتقد تھی۔ ایک بات ذہن میں آتی تھی۔ اُس کے خاوند نے یا اُس کی پسند کے آدمی نے اسے مقتول کے ساتھ کھڈ میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا۔ قاتل خالی ہاتھ ہوگا، اِس لئے اس نے مقتول کا گلا دبا کر اسے ہلاک کیا۔ خاوند کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ کمزور سا آدمی ہے لیکن قتل پہلوان نہیں کیا کرتے۔ بلّی بڑی کمزور جانور ہوتی ہے مگر روکی ہوتی اور تنگ آتی ہوتی بلّی اپنے بچاؤ کے لئے انسان پر شیر کی طرح حملہ کرتی ہے۔ میں تصور میں دیکھ رہا تھا کہ اُس خاوند کے اندر کیسے اُبال اُٹھ رہے ہوں گے جس کی بیوی (جن کی زبان میں) اُس سے طلاق لینے کی بات کر رہی تھی۔ اگر دوسرے آدمی نے جسے ناجو پسند کرتی تھی، آصف درما کو قتل کیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُس نے دیکھا ہوگا کہ مقتول نے لڑکی کے ساتھ دوروں کی حالت میں ناجائز مراسم پیدا کر لئے ہیں۔

## زیور دوں گی، یہ قیمت نہیں دوں گی

ان نمبرداروں نے ایسی دو اور عورتوں کے کیس سنائے۔ وہ بھی مقتول کے زیرِ علاج تھیں۔ میں نے ان کی بھی تفصیل سُن کر انہیں فہرست میں شامل کر لیا اور ناجو سے تفتیش شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی دوسرے گاؤں سے بھی ایسی ہی رپورٹیں آئیں گی اور پوچھ گچھ کا نیا سلسلہ بڑا ہی لمبا ہوگا۔ شاہ قلندر تو میرے قبضے میں تھا ہی۔ اُس سے میرا شک صاف نہیں ہوا تھا۔ اب مجھے بتایا گیا کہ ناجو خوبصورت اور جوان لڑکی ہے اور وہ پہلے شاہ قلندر کے زیرِ علاج رہی پھر آصف درما کے پاس



آگئی۔ جن نے قلندر کو دُھتکار دیا تھا۔ یہ اُس پر ایک چوٹ تھی۔ چنانچہ اُس نے انتقام لیا ہوگا۔

میں نے شاہ قلندر کو جگا لیا اور اُس سے پوچھا کہ ناجو کے متعلق وہ جو کچھ جانتا ہے مجھے بتا دے اور اگر اُس نے کچھ چھپایا تو اُس کے خلاف شک پکّا ہو جائے گا کیونکہ مجھے ساری بات کی رپورٹ مل چکی ہے۔

اُس نے بتایا کہ ناجو اُس کے ہاں گئی تھی۔ اُس نے اپنی مراد یہ بتاتی تھی کہ اُس کا خاوند اُسے طلاق دے دے اور جس آدمی کی اُس کے دل میں محبت ہے وہ اُس کے ساتھ شادی کر لے۔ اُس نے شاہ قلندر کو یہ بھی بتایا کہ وہ آدمی اُسے اپنانا چاہتا ہے کہ اُس نے ماں باپ کا پسند اور طے کیا ہوا رشتہ قبول نہیں کیا۔ شاہ قلندر نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا کہ اُسے یہ لڑکی اتنی اچھی لگی کہ اُس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے لڑکی کو تعویذ دیا جو پانی میں گھول کر خاوند کو پلانا تھا اور اُسے کہا کہ وہ ہر روز اُس کے پاس آتی رہے اور وہ اُسے ایک ایسا ٹونہ بتائے گا کہ وہ چاہے گی تو اُس کا خاوند اچانک بیمار ہوگا اور مر جائے گا پھر جسے وہ چاہتی ہے اُس کے ماں باپ اُس کے رشتے کے لئے دوڑے آئیں گے۔

لڑکی آتی رہی اور شاہ قلندر اُسے ہر روز ایک یا دو تعویذ دیتا رہا۔ کوئی گھول کے خاوند کو اس طرح پلانا تھا کہ اُسے پتہ نہ چلے کہ اُس پانی میں تعویذ گھولا گیا ہے۔ کوئی تعویذ گھر میں کہیں فرش یا دیوار میں دبانا تھا۔ ایک روز شاہ قلندر نے جب دیکھا کہ لڑکی اُس کے جال میں آگئی ہے تو اُسے اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا کر عملاً اپنی نیّت کا اظہار کرنے لگا۔ لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شاہ جی! میں آپ کو نقد بھی دوں گی اور اگر آپ کو سونا پسند ہے تو کچھ زیور بھی دے دوں گی"—— لڑکی نے شاہ قلندر سے کہا —— "لیکن یہ قیمت نہیں دوں گی۔ مجھے معلوم ہے آپ عورتوں سے یہ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں لیکن شاہ جی! آپ کو خدا کا خاص بندہ سمجھ کر آئی تھی۔ ایسے بندے تو مجھے

گاؤں میں بہت مل سکتے ہیں جیسے آپ بن گئے ہیں۔"

شاہ قلندر نے اُس پر زبان کا جادو چلانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہا کہ اُس کے مؤکل (جنات) اُس کا کام کر دیں گے لیکن ناجو اُس کے ہاتھ نہ آئی۔
شاہ قلندر نے تنگ آکر اُسے طعنہ دیا کہ وہ نیک پاک بنی پھرتی ہے اور اس کے تعلقات ایک غیر مرد کے ساتھ ہیں۔ ناجو نے اُسے کہا کہ یہ خدا جانتا ہے۔ ابھی میرے جسم کا مالک میرا خاوند ہے۔ میرے دل میں اس کی نفرت بھری ہوتی ہے لیکن وہ میرا خاوند ہے اس لئے اس کے سوا میں کسی اور کو اپنا جسم نہیں دے سکتی۔

شاہ قلندر نے مجھے ناجو کی یہ بات سناتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا اور کہا —— "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہر عورت ایسی نہیں ہوتی کہ لالچ اور مصیبت میں آکر ضرورت پڑے تو اپنی عزت سے دستبردار ہو جاتے۔"
شاہ قلندر بڑا چالاک اور گھاگ تھا لیکن ناجو اُسے دھتکار کر چلی گئی۔
شاہ قلندر نے مجھے بتایا کہ تین چار روز بعد ایک گاؤں سے ایک آدمی آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ اس کی بیٹی پر جن کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہ لڑکی کو بہت تکلیف دے رہا ہے۔ شاہ قلندر گھوڑی پر سوار ہوا اور جب لڑکی کے گھر پہنچا تو اس نے ساری نشانیاں جنوں والی دیکھیں۔ چونکہ ناجو کو وہ اچھی طرح جانتا تھا اس لئے سمجھ گیا کہ لڑکی نے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ شاہ قلندر اس کا بھانڈہ پھوڑ سکتا تھا لیکن اسے یہ اُمید نظر آئی کہ وہ اس ڈھونگ میں لڑکی کی مدد کرے گا پھر شاید لڑکی اُس کے قبضے میں آجائے۔

"جناب!" —— شاہ قلندر نے مجھے یہ کہانی سناتے ہوئے کہا —— "آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ لڑکی کتنی نڈر اور چالاک ہے۔ اس نے اپنا حلیہ بگاڑ کر چڑیلوں جیسا کر لیا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو چڑیلوں کی طرح دانت نکال کر چیخنے لگی پھر بولی —— 'میرے پیر اُستاد آصف ورما کو بلاؤ۔ اس شاہ کو باہر نکال دو' —— اور وہ دانت نکال کر سخت غصے کی حالت میں میری



طرف آئی۔ میں باہر نکل گیا.... میں نے ابھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ لڑکی ڈھونگ رچا رہی ہے اور آصف ورما اس کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد مجھے پتہ چلتا رہا کہ آصف وہاں جاتا ہے۔"
شاہ قلندر نے ایک اور اعتراف کیا۔ کہنے لگا —— "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اُسے قتل کر دوں گا۔ البتہ میں نے ناجو کے اس سلوک کے بعد آصف ورما کو پیغام بھیجا تھا کہ میں نے تمہاری اسامی کبھی نہیں توڑی اور تم میری اسامیوں کو توڑ کر مجھے بدنام کر رہے ہو۔ ان حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ میں تمہیں بدنام کرنے پر آ گیا تو یہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"
"اُس نے جواب دیا ہوگا؟"
"ہاں!" —— شاہ قلندر نے کہا —— "اُس نے کہلا بھیجا تھا کہ دُنیا دیکھے گی کون علاقہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔"
"اور تم نے اُسے قتل کرا دیا" —— میں نے کہا۔
"نہیں ملک صاحب!" —— اُس نے کہا —— "میرا ارادہ یہ تھا کہ اپنے آدمیوں سے اس کی پٹائی کراؤں گا۔"
مجھے یہی نظر آ رہا تھا کہ کسی بھی وقت شاہ قلندر کہہ دے گا کہ قتل اسی نے کیا ہے۔ میں نے ناجو، اس کے خاوند اور اُس آدمی کو تھانے بلوایا جس کے ساتھ ناجو شادی کرنا چاہتی تھی۔ اُس کا نام نمبردار نے بتایا تھا۔ شاید ظہور یا شکور تھا۔ آپ اسے ظہور سمجھ لیں۔

## چال چلن کی پکی تھی

ناجو واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر انیس بیس سال تھی اور چہرے سے کنواری لگتی تھی۔ مجھے اُس کے چہرے پر جلالی سی کیفیت نظر آتی جو اُس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔ جسم کی ساخت اور لمباتی تو اور زیادہ دلکش تھی۔ وہ عام قسم کی دیہاتی لڑکی نہیں تھی۔ اگر وہ بدمعاش تھی تو بھی اس کی نسل خاص

تھی اور اگر شریف اور نیک تھی تو بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کا خاوند ساتھ تھا۔ وہ تو اُس کا نوکر بھی نہیں لگتا تھا۔ ایسے جیسے بھکاری اس امیرزادی کے پیچھے پیچھے آرہا ہو۔ یہ برادری کے قواعد وضوابط کی کراتی ہوئی شادی تھی۔ لڑکی پر بھی ظلم لڑکے کے ساتھ بھی زیادتی۔ لڑکی کے خاندان کی بڑی اچھی زمینداری تھی۔

ان دونوں کے ذرا بعد ظہور آ گیا۔ وہ کھُلتے ہوتے رنگ کا خُوبرو جوان تھا۔ قد بھی اچھا، شکل وصورت بھی اچھی۔ میں نے اُسے ان دونوں سے الگ بٹھا دیا۔ ناجو کے خاوند کو میں اندر لے گیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیوی کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ جن ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُسے معلوم ہے یا نہیں کہ اس کی بیوی نے ڈھونگ رچا رکھا ہے اور مقتول اس ڈھونگ میں شامل تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ جن ہے جس نے تمہاری بیوی پر قبضہ کر رکھا ہے؟"

"اس کا بھی یقین ہے" —— اس نے کہا —— "اور اس کا بھی کہ یہ جن آصف ورما نے اس پر قابض کیا ہے۔ یہ مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے۔"

"کیا تم مانتے ہو کہ آصف ورما کے قبضے میں جن تھے؟"

"ہاں جی!" —— اُس نے کہا —— "آپ نہیں مانتے؟ ... جس طرح سپیرے سانپ پکڑتے ہیں اسی طرح آصف ورما جنّوں کو پکڑا کرتا تھا جو جن میری بیوی پر قابض کیا گیا تھا اسے آصف ورما نے کہا تھا کہ میں بیوی کو طلاق دوں تو وہ مجھے بخشے گا ورنہ میرا نقصان کرے گا۔"

اُسے ذرا سا بھی شک نہیں تھا۔ وہ صرف یہ سمجھتا تھا کہ ایک جن کو ساتھ ملا کر اسے طلاق دینے پر مجبور کیا گیا ہے۔

"تم نے پھر بھی طلاق نہیں دی" —— میں نے کہا —— "تم جن سے ڈرے نہیں تھے؟"

"میں تو اس جن کے آنے سے بہت پہلے اسے طلاق دینا چاہتا



تھا لیکن میرا باپ اور میرا بڑا بھائی اتنے بے غیرت ہیں کہ وہ نہیں مانے۔ مجھے کہتے تھے کہ طلاق دینا بے غیرتی ہے۔ خدا گواہ ہے کہ اس کے ساتھ میرے میاں بیوی والے تعلقات کئی مہینوں سے ختم ہیں۔"

"کیوں؟" —— میں نے پوچھا —— "اس کا چال چلن ٹھیک نہیں؟"

"نہ جی!" —— اس نے کہا —— "میں کمین ذات کا آدمی نہیں ہوں۔ اگر بیوی مجھے اچھا نہیں سمجھتی تو میں ثبوت اور شہادت کے بغیر اس پر الزام نہیں لگاؤں گا۔ سچی بات یہ ہے جی! میں اس رشتے میں راضی نہیں تھا۔ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور میں جو کچھ ہوں وہ آپ دیکھ رہے ہیں، مگر برادری کے فیصلے کو میں نہیں ٹال سکتا تھا۔ یہ میرے گھر دلہن بن کر آئی تو ایسے جیسے پتھر آیا ہو۔ میں نے دل کو تسلّی دے لی کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کی بات چیت اس آدمی کے ساتھ ہے جس کا نام ظہور ہے۔ شادی کے چوتھے مہینے بیوی نے مجھے کہنا شروع کر دیا کہ میں تمہارے ساتھ صرف جسمانی تعلق رکھ سکتی ہوں کیونکہ تم میرے خاوند ہو لیکن میں تمہیں دل کی وہ محبت نہیں دے سکتی جو ظہور کے ساتھ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھ پر بدچلنی کی تہمت لگاتے ہو تو لگاتے رہو۔ خدا کو پردوں کے اندر کا حال معلوم ہے۔ مسجد میں قرآن کی قسم کھا سکتی ہوں ....

"آپ میری بیوی کو نہیں جانتے۔ اسے دیکھ کر لوگ یہی کہتے ہیں کہ لڑکی صاف چلن نہیں، لیکن چلن کی بڑی سخت لڑکی ہے۔ اس نے مجھے کہنا شروع کر دیا کہ کوئی بہانہ بنا کر مجھے طلاق دے دو۔ میں نے اپنے باپ اور بھائی سے بات کی تو انہوں نے اُلٹا مجھے بے غیرت کہنا شروع کر دیا اور یہ بھی کہا کہ عورت ذات کو اپنی جُوتی کے نیچے رکھو۔ اگر تم دوسری شادی کرنا چاہتے ہو تو اسے طلاق نہیں دیں گے۔ اسی پہ دوسری دلہن لائیں گے۔ میں مجبور ہو گیا۔ میں نے دل سے اسے طلاق دے دی تھی۔"

"ظہور کو تو تم اپنا دشمن سمجھتے ہو گے۔"

"نہ جی!" —— اس نے کہا —— "بیوی اپنی اُس کے پیچھے جاتے تو اُسے

میں دشمن کیوں سمجھوں؟ اگر بیوی مجھے یہ کہتی کہ ظہور اس کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا ہے تو دنیا دیکھتی کہ ظہور کی لاش کہاں ہے .... مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری بیوی شاہ قلندر کے پاس جاتی رہی ہے۔ وہ مجھے پانی پلاتی تھی تو میں سمجھ جاتا تھا کہ اس میں تعویذ گھولا ہوا ہے۔ میں پی جاتا تھا جیسے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تمہاری بیوی نے آصف ورما کے ساتھ مل کر اپنے اوپر جن قابض کیا ہے" — میں نے کہا — "اور جن کہتا تھا کہ ناجو کو خاوند سے طلاق دلاؤ۔ تم نے آصف ورما سے انتقام لینے کی تو سوچی ہوگی؟"

"نہ جی!" — اُس نے ڈرے ہوتے لہجے میں کہا — "میں جنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جنوں نے اپنے پیر اُستاد کو مار ڈالا ہے۔ میں کیا چیز ہوں؟"

میں نے اُسے بہت ٹھوکا اور بجایا۔ ایسے ایسے سوال اور ایسی ایسی جرح کی کہ وہ چکرا جاتا تھا مگر مجھے یقین ہونے لگا کہ قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں نے اسے مشتبہ فہرست میں شامل رکھا۔ ابھی تو مجھے بڑی لمبی تفتیش کرنی تھی۔ میں نے اُسے باہر بیٹھنے کو کہا اور ظہور کو بلایا۔

## شادی سے انکار کر دیا

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ظہور خوبصورت جوان تھا۔ ناجو کی شادی اسی کے ساتھ ہونی چاہیے تھی مگر میرا مسئلہ ان کی شادی نہیں تھا۔ ظہور کو میں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"دیکھو ظہور رے!" — میں نے اُسے ذرا رعب دار آواز میں کہا — "میں اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں سُنوں گا۔ فوراً مان جاؤ کہ تم نے ناجو کو خاوند سے طلاق دلانے کے لئے آصف ورما کے ساتھ مل کر جن کا ناٹک کھیلا تھا۔ اب وہ جن کہاں ہے؟ ناجو اچھی بھلی ہے۔"



"وہ آصف ورما کا جن تھا جی!" — اُس نے گھبراتی ہوتی آواز میں کہا — "آصف ورما مر گیا ہے اور جن آزاد ہو کر چلا گیا ہے۔"

"تم نے وہی بکواس شروع کر دی ہے جس سے میں تمہیں منع کر چکا ہوں" — میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی جو میں نے میز سے اٹھائی تھی۔ میں نے کہا — "جب تک اصل بات نہیں بتاؤ گے تھانے میں ہی رہو گے۔ سچی بات فوراً اُگل دو.... تم نے آصف ورما کو کیوں قتل کیا ہے؟"

وہ اس طرح ہڑبڑا کر کرسی سے اُٹھا جیسے اُسے کسی نے گہرے پانی میں ڈبو دیا ہو اور وہ ہاتھ پاؤں مارتا اُبھر آیا ہو۔

"اللہ کی قسم .... نہ جی! قرآن پاک کی قسم .... میں نے اُسے قتل نہیں کیا" — وہ سخت گھبراتی ہوتی آواز میں ہکلانے لگا — "اُسے کون قتل کر سکتا ہے .... اُس کے قبضے میں جن تھے۔"

"اُسے کسی نے قتل کر دیا ہے ظہور رے!" — میں نے غصیلی آواز میں کہا — "اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں تھا۔ تم نے ناجو کو آصف ورما کے ساتھ کھنڈر میں جاتے دیکھ لیا تھا اور اچانک جا کر آصف ورما کا گلا دبا لیا۔"

وہ رونے پر آ گیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ اُس پر الزام لگاتے اور ایسی شہادتوں کا ذکر کیا جن کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اُس کی حالت غیر ہو گئی۔

"میں آپ کو ایک بات بتاتے ڈرتا ہوں" — اُس نے کہا — "ڈر یہ ہے کہ آپ کہیں گے کہ میری اُس کے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی تھی اس لئے اُسے میں نے ہی قتل کیا ہے۔"

"میرا دماغ خراب نہیں ظہور رے!" — میں نے کہا — "تم نے دل میں جو کچھ چھپا رکھا ہے وہ بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے" — میں نے اُس پر جھک کر شفقت کے لہجے میں کہا — "مجھے اس کافر کے مارے جانے

کا کوئی افسوس نہیں۔ اچھا ہُوا ایک دھوکہ باز فریبی مارا گیا ہے۔ وہ میرا تو کچھ نہیں لگتا تھا۔ مجھے ان کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ تم پر مقدمہ بنا کر میرے دل کو بہت دُکھ ہوگا۔ اگر مان جاؤ گے کہ تم نے اُسے قتل کیا ہے تو وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔"

میرے بدلے ہوتے لہجے سے اُس کی جان میں جان آئی۔

"آپ مان جائیں سرکار! میں نے اُسے قتل نہیں کیا" — اُس نے بھکاریوں کے لہجے میں کہا — "اگر مجھے اُس کے جنّوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اُسے ضرور قتل کرتا۔ میرا زور ناجو پر چل سکتا تھا۔ اُسے میں نے کہہ دیا ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے ماں باپ سے کہہ دیا ہے کہ جہاں وہ میری بات پکی کرنا چاہتے ہیں کر دیں۔"

یہ شخص بھی مجھے قتل کے الزام میں بری نظر آنے لگا۔ اُس کے انکار کا انداز ایسا تھا جو مجھے یقین دلا رہا تھا کہ یہ شخص قاتل نہیں۔ تھانیداروں کو پیشہ ور مجرم "چکر" دیا کرتے ہیں۔ وہ بڑی مہارت سے جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ وہ چونکہ تجربہ کار ہوتے ہیں اس لئے اپنے جھوٹ پر ڈٹے رہتے ہیں۔ ظہور جیسے دیہاتی کتنے ہی مُنہ زور اور نڈر کیوں نہ ہوں، پولیس سے اپنا جرم نہیں چھپا سکتے۔ اُن کے چہروں سے پتہ چل جاتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ جھوٹ ہے یا سچ۔ ظہور کا انکار مجھے سچا معلوم ہوتا تھا۔ اس سے مجھے کوئی نہ کوئی سراغ ملنے کی توقع پیدا ہوگئی تھی۔ یہ بھی میرے لئے کافی تھا لیکن میں نے اُس کو اس خوف میں مبتلا رکھا کہ وہ مشتبہ ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے پوری بات سُنائے اور اچھی طرح بتائے کہ اس نے ناجو سے شادی کرنے سے انکار کیوں کر دیا ہے۔

## میں قرآن کی قسم کھا سکتی ہوں

اُس نے پہلے تو وہی بات سنائی جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں، یعنی



اس کی اور ناجو کی محبت تھی مگر محبت ناجو کی شادی کے بعد شروع ہوئی۔ ظہور نے اپنی منگنی نہ ہونے دی۔ ناجو نے قسم کھائی کہ وہ خاوند سے طلاق لے گی۔ خاوند نے جیسا کہ اپنے بیان میں بتایا تھا کہ اُس نے ناجو کے مطالبے پر اُسے طلاق نہ دی۔ ظہور اور ناجو نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شاہ قلندر ہجویری سے تیر بہدف تعویذ مانگا۔ شاہ قلندر نے اس سے جو قیمت لینا چاہی وہ ناجو کو منظور نہیں تھی۔ اُس نے ظہور کو بتایا۔ ظہور نے اسے وہاں جانے سے روک دیا۔

دونوں آصف درما سے ملے۔ اُس نے یہ ترکیب بتائی کہ وہ اپنے ایک جن کو استعمال کرے گا۔ جن ناجو پر قابض ہوجائے گا اور کہے گا کہ ناجو کا خاوند اسے طلاق دے دے کیونکہ یہ لڑکی اس جن کو پسند آگئی ہے، پھر جن یہ کہے گا کہ وہ اس کی شادی اپنی پسند کے آدمی سے کرائے گا۔ ناجو کے سُسرال ڈر کر اسے طلاق دے دیں گے۔ ظہور اور ناجو کو یہ ترکیب پسند آگئی۔ دونوں جنات کو مانتے تھے اور یہ بھی کہ آصف درما کے پاس واقعی جن ہیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع ہوگیا اور آصف درما کو بلایا گیا۔

"مجھے اطلاع ملی کہ آصف درما نے اپنا کام شروع کر دیا ہے تو بہت خوشی ہوئی" — ظہور نے مجھے بتایا — "ایک عورت مجھے ہر روز خبر دیتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے .... چار پانچ دنوں بعد آصف درما کے ساتھ میری ملاقات ہوگئی۔ اُس نے مجھے کہا — 'ناجو کو دل سے اتار دو ظہور! ناجو میری بیوی بن رہی ہے۔ میری اور اس کی بات پکی ہوچکی ہے' — میں اُس کی اس بات سے جل اُٹھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ میرے ساتھ فریب کاری کر رہا ہے۔ اس نے مجھ پر رُعب جھاڑا تو میں نے اُسے گالیاں دیں۔ اس نے کہا — صرف نکاح پڑھنا رہ گیا ہے۔ ویسے ناجو میری بیوی بن چکی ہے۔ تمہیں کسی نے بتایا نہیں؟ وہ ایک ایک گھنٹہ میرے ساتھ اکیلی بند کمرے میں رہتی ہے۔ وہ مجھ سے بہت خوش ہے۔ اگر تم نے اور زیادہ بکواس کی تو یہی جن تم پر ڈال دوں گا اور وہ تمہیں پاگل کرکے گاؤں گاؤں پھراتا رہے گا'....

”سرکار! میں نے جنّوں کے ڈر سے اپنا خون پی لیا۔ میں نے اس عورت کو جو میرے اور ناجو کے درمیان پیغام لاتی لے جاتی تھی، ناجو کے لئے پیغام بھیجا کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ یہ عورت ناجو کے پاس گئی۔ ناجو نے پیغام کا جواب دیا کہ اُسی جگہ فوراً ملو۔ میں اُس جگہ چلا گیا۔ ناجو بھی آگئی۔ میں نے اُسے دیہاتی معاشرے کی بھی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔

میں ظہور کو ابھی بے گناہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے آصف ورما کے ساتھ دشمنی کی بڑی مضبوط وجہ بتا دی تھی۔ میں نے یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ شخص آصف ورما کے جنّوں سے ڈرتا تھا لیکن بعض حالات میں بزدل آدمی بھی پاگل پن کی حد تک دلیر ہو جاتا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ ناجو سے پوچھ گچھ کر لوں۔

میرے پاس اب تین مشتبہ اشخاص تھے۔ پہلے نمبر پر شاہ قلندر تھا، دوسرے پر ظہور اور تیسرے نمبر پر ناجو کا خاوند۔ ناجو پر میں قتل کا شک نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں ظہور جیسا منہ زور اور دلیر شخص جنّوں سے ڈر گیا تھا وہاں ایک عورت اتنی دلیر نہیں ہو سکتی تھی۔

# چُوڑیاں ٹوٹ گئیں

اب ناجو میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس میں عجیب سی قسم کی کی دلکشی تھی جو میں نے اس سے زیادہ خوبصورت عورتوں میں بھی نہیں دیکھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا مجھے وقار اور خود اعتمادی کی صاف جھلک نظر آتی اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ بھی تھی۔ میں اُسے کچھ دیر اسی طرح دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بڑھنے لگی اور وہ بے چین سی ہو گئی۔

بُرا بھلا کہا کہ میں نے اُس کی خاطر اپنی منگنی نہیں ہونے دی اور اُس نے آصف ورما کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا ہے۔ وہ سُن کر بہت پریشان ہوئی قسمیں



کھانے لگی کہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے یہ بات آصف ورما نے بتائی ہے۔ میں نے اس کی قسموں پر اعتبار نہ کیا اور سوچا کہ جو لڑکی اپنے خاوند سے اتنی چالاکی سے جان چھڑا رہی ہے وہ میری بیوی بن کر مجھے بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں شادی کر رہا ہوں جہاں میرے ماں باپ کرانا چاہتے ہیں ....

”میں نے اُسے ایسی ذلیل باتیں کہہ دیں کہ وہ غصّے میں آگئی۔ آپ اسے نہیں جانتے۔ یہ بڑی سخت طبیعت کی لڑکی ہے۔ اس میں مردوں جیسی دلیری ہے۔ اس نے دیکھا کہ میں اس کی قسموں پر اعتبار نہیں کر رہا تو اس نے میری منت سماجت نہ کی بلکہ غصّے میں چلی گئی۔ میں نے اپنے ماں باپ سے کہہ دیا کہ میری منگنی کر دیں۔ تیسرے دن یعنی کل پتہ چلا کہ آصف ورما کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اُسے اسی جن نے مارا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ بعض جن ایسے ہوتے ہیں کہ جس پیر یا عامل کے قبضے میں ہوتے ہیں اُسے بھی کوئی بُری حرکت نہیں کرنے دیتے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اُسے مار ڈالتے ہیں۔“

میں اُس کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ پیر اور عامل ان سیدھے سادے دیہاتیوں کو کیسے کیسے چکروں میں ڈالے رکھتے ہیں۔ یہ تفتیشی کہانی جو میں آپ کو سُنا رہا ہوں، ہمارے آج کے

”ناجو!“ — میں نے کہا — ”مجھ سے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دل سے اُتار دو کہ تم تھانے میں بیٹھی ہو۔ مجھے تم پر کوئی شک نہیں۔ یہ دیکھ لو کہ میں نے کس کس کو یہاں بلا رکھا ہے۔ شاہ قلندر کو پچھلے کمرے میں کل سے بٹھایا ہوا ہے۔ ان سب نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ تم یوں کرنا کہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔“

”میں نے اُسے قتل نہیں کیا“ — ناجو نے کہا — ”میں عورت ذات اتنی دور کھڈ میں جا کر ایک طاقتور مرد کو کس طرح قتل کر سکتی تھی۔“

”میں نے تم پر قتل کا شک نہیں کیا“ — میں نے کہا — ”تم کیوں

مری جارہی ہو۔"

وہ میرے بائیں طرف بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے لمبی اور کُرتے کی طرح کھُلی آستینوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے اپنے دائیں بازو کی آستین اُوپر کی جو شاید اُس کی عادت تھی۔ اکثر لوگ باتیں کرتے مختلف حرکتیں کیا کرتے ہیں جو ان کی عادت بن جاتی ہے۔ اس عادت کے تحت ناجو نے پہلے بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کی آستین اُوپر کی پھر دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کی آستین اُوپر کی، پھر دائیں بازو کی آستین نیچے سرک آئی۔ میری نظر اُس کی کلائیوں پر پڑی۔ دونوں کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ ایک میں زیادہ دوسری میں کم۔ یہ دو رنگوں کی تھیں۔

مجھے اُس کی اس کلائی پر جس میں چوڑیاں کم تھیں کچھ اور بھی نظر آیا۔

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اور کلائی پر آستین کا پردہ ڈال دیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ میں تو تجربہ کار تھا کوئی اناڑی اُس کا چہرہ دیکھتا تو کہتا کہ لڑکی کو اچانک کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے میرے ہاتھ سے کلائی پیچھے کر لی تھی۔ مجھے یہ شک تو نہیں تھا کہ مقتول کو اس نے قتل کیا ہے، یہ نظر آگیا تھا کہ کھڈ میں جو عورت گئی تھی وہ یہی تھی۔ اگر یہی تھی تو سمجھتے کہ قاتل مل گیا۔ قاتل کو صرف یہ لڑکی جانتی تھی۔

میرے پاس ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے جو دو رنگوں کے تھے۔ یہ مجھے جائے واردات سے ملے تھے۔ ناجو کی چوڑیوں کے یہی رنگ تھے۔ یہ اتنا ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ دیہات کی عورتیں ایسے ہی رنگوں کی چوڑیاں پہنا کرتی تھیں۔ ان رنگوں کی چوڑیاں صرف ناجو کی ہی کلائیوں میں نہیں تھیں۔ ان ٹکڑوں سے میں ذرا مدد لے سکتا تھا۔ ناجو کی ایک کلائی پر مجھے خراش سی نظر آئی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کلائی چھپا کر اپنے خلاف شک پیدا کر دیا تھا۔

میں نے اپنا طریقہ اختیار کیا۔ میز کی دراز سے چوڑیوں کے ٹکڑے نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے اور نظریں اس کے چہرے پر جما



دیں۔ اُس نے یہ ٹکڑے دیکھے اور اُس کے چہرے سے وقار، خود اعتمادی اور بے خوفی کے تاثرات بالکل اُڑ گئے۔ پیچھے خوف اور گھبراہٹ کا تاثر رہ گیا۔ وہ اتنی بے خبر ہو گئی کہ میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کی اور دیکھا کہ اُس پر نصف انچ سے ذرا زیادہ لمبی خراش تھی جس کا ایک سرا کچھ گہرا تھا۔ خراش دُھلی ہوئی تھی اور اس میں جما ہُوا خون نظر آرہا تھا۔ اب کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی۔ مقتول نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑی ہو گی۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور ایک چوڑی کا ٹوٹا ہُوا سرا اس کی کھال چیر گیا۔

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا ـــ "تمہارے ساتھ کون تھا؟"

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔

"تمہارے ساتھ کون تھا؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "یا وہ کون تھا جو اچانک آگیا تھا؟"

وہ اُسی طرح میرا مُنہ دیکھتی رہی۔ مجھے شک ہونے لگا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے مر گئی ہو۔ اُس کا رنگ بہت اچھا تھا جو پیلا پڑ گیا۔

"ناجو!" ـــ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ـــ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ مجھے بتا دو۔ میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا" ـــ میں نے ہمدردی اور شفقت کے لہجے میں اُس کا دل مضبوط کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں کیں کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور میری طرف دیکھا۔ اب اُس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر تھا جیسے میری پناہ کی طلب گار ہو۔ میں نے اُسے اور زیادہ حوصلہ دیا کیونکہ اُس وقت تک وہ میری ملزم یا مشتبہ نہیں بلکہ گواہ تھی۔

# لڑکی کو بلیک میل کیا

"آپ تو میری کوئی مدد نہیں کر سکتے" — اُس نے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتا؟" — میں نے کہا — "ابھی سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم کچھ کہو تو سہی۔ جو مدد مانگو گی دوں گا۔"

"مجھے اتنی سی مہلت دے دیں کہ ظہورے کو قتل کر دوں" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا کہ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ کیسا لہجہ ہے۔

"ظہورے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" — میں نے پوچھا — "جانتی ہو قتل کی سزا کیا ہے؟"

"قتل ایک کرو یا دو کرو، سزا تو ایک ہی ملتی ہے" — اُس نے کہا۔

ایسی ہی کچھ اور معمہ نما باتیں کر کے اس نے یہ کہہ کر مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا — "اس فریبی آصف ورما کو میں نے قتل کیا ہے" — اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بولی — "اپنی عزت کی خاطر.... وہ اچھی رہتی ہیں جنہیں اپنی عزت کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔"

اُس نے کچھ دیر بعد اپنے جُرم کی ساری تفصیل سُنا دی جو اختصار کے ساتھ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ اس کا ایک حصہ تو آپ سُن چکے ہیں۔ اُسے یہ خاوند اچھا نہیں لگتا تھا۔ ظہورا اسے اچھا لگنے لگا۔ اپنے خاوند کو اس نے طلاق کے لئے کہا۔ وہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں کہ خاوند نے طلاق کیوں نہ دی۔ ظہورے نے اُسے کہا کہ شاہ قلندر کی کرامات کی بہت شہرت سُنی ہے۔ وہ اس کے پاس جائے۔ وہ گئی۔ شاہ قلندر کی نیت خراب ہو گئی۔

"میں اسے خدا تک پہنچا ہُوا انسان سمجھتی تھی" — ناجو نے کہا — "اُس نے اپنے آپ کو آسمان سے گرا کر زمین پر پھینک دیا۔ میں نے اسے دھتکار دیا تو اُس نے کہا کہ یہاں کسی عورت نے آکر ہمارا دل نہیں توڑا۔ ہمارا دل خوش کر کے عورتیں روحانی خوشی حاصل کرتی ہیں .... اللہ گواہ



ہے کہ ظہورے کے ساتھ میری محبت پاک تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ خاوند طلاق دے دے اور تمہارے ساتھ میرا نکاح پڑھا جاتے تو میرا جسم تمہارا ہے۔ طلاق اور نکاح کے بغیر میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانا۔"

یہی اُس کی دلیری اور طاقت کی بنیاد تھی۔ اس نے ظہور کو بتایا کہ شاہ قلندر کے پاس بدمعاشی کے سوا کچھ نہیں۔ اُس نے اسے اُس کے ہاں جانے سے روک دیا۔ وہ بہت مایوس اور پریشان ہوتی۔ ان کی رازدار ایک میراثن تھی جو ان کے پیغام انہیں پہنچاتی تھی۔ اس نے ناجو کو بتایا کہ آصف ورما کے قبضے میں جن ہیں۔ ان سے وہ بہت کام لے سکتی ہے۔ میراثن نے اُسے ایک کہانی سنا دی کہ فلاں گاؤں کے ایک آدمی نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اُسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی آصف ورما کو اس آدمی کے باپ نے بہت رقم دی۔ آصف ورما کے جن اس آدمی کو پھانسی کے تختے سے اُٹھا لائے۔

میراثن کے مشورے پر ظہورا اور ناجو الگ الگ آصف ورما سے ملے۔ دونوں اس یقین کے ساتھ اس کے پاس گئے تھے کہ آصف ورما کے پاس جنات ہیں۔ اس نے ناجو کو اکیلے بلایا۔ وہ گئی تو آصف ورما نے اُسے کہا کہ وہ گھر جا کر ہاتھ یوں موڑے، چیخیں مارے، آنکھیں چڑھاتے، لیٹے لیٹے اُچھلے اور فرش پر گرے اور کسی کے سنبھالے سے نہ سنبھلے۔ آصف ورما نے اُسے ریہرسل کراتی۔ خود یہ حرکتیں کر کے دکھائیں، پھر اُسے کہا کہ اس کے گھر والے اُسے (آصف ورما) کو ہی بلائیں گے۔ علاقے میں شاہ قلندر بھی تھا۔ آصف ورما نے ناجو سے کہا کہ اس کے گھر والے اگر شاہ قلندر کو بلا لیں تو ناجو اور زیادہ مُنہ زور ہو جاتے اور کہے کہ میرے پیر اُستاد آصف ورما کو بلاؤ۔ مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی ہے۔ یعنی ناجو کی زبان سے جن بولے گا۔

یہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں کہ ناجو نے یہ ناٹک کیسی خوش اسلوبی سے کھیلا تھا۔ وہ ابھی تک یہ سمجھ رہی تھی کہ آصف ورما اس پہ ایک جن قابض کر دے گا جو اس کا کام کر دے گا۔ ہُوا یہ کہ شاہ قلندر کو بلا لیا گیا۔ ناجو نے یعنی "جن" نے اُسے دھتکار دیا۔ پھر آصف ورما کو بلایا گیا۔ اس نے آکر اعلان کیا کہ یہ

بڑا خطرناک جن ہے جو ذرا مشکل سے ہی نکلے گا۔ اس نے سب کو باہر نکال کر ناجو کو کمرے میں بند کر لیا اور اسے مزید ہدایات دینے لگا۔ اُس نے ناجو کو دن اور رات کے کچھ وقت بتاتے جب اُسے یہ ایکٹنگ کرنی تھی۔

ناجو نے یہ ایکٹنگ بڑی کامیابی سے کی۔ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ آصف ورما نے پہلے دن جن نکال دیا اور گھر والوں کو بتایا کہ اب جن فلاں وقت آئے گا۔ ایسے ہی ہُوا۔ اُس وقت ناجو نے پھر بڑی ڈراؤنی ایکٹنگ شروع کر دی۔ آصف ورما بغیر بلائے آگیا۔ کہنے لگا میں نے اسے آتے دیکھ لیا تھا اس لئے میں دوڑا آیا۔ یہ مجھ سے پہلے پہنچ گیا ہے۔

اُس نے ناجو کو کمرے میں اپنے ساتھ بند کر لیا۔ ناجو نے اسے کہا کہ آپ کا جن کہاں ہے؟ آصف ورما نے اُسے ہنس کر ٹال دیا۔ دوسرے دن ناجو نے پھر اپنے اُوپر جن کا دَورہ طاری کیا اور آصف ورما نے آکر سب کو کمرے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا تو ناجو نے اُسے کہا کہ اس کے لئے یہ کام بہت مشکل ہے۔ یہ کام جن سے کراؤ۔ آصف ورما نے اسے کہا کہ اُسے اپنا مطلب حل کرنے سے غرض ہونی چاہیئے۔ جن اصلی ہو یا نقلی، طلاق مل جاتے گی۔ اس نے ناجو سے کہا ـــ "اب یہ کہنا شروع کر دو کہ یہ لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔ اسے اس کا خاوند طلاق دے دے ورنہ نقصان اُٹھائیگا"

ایسے ہی ایک "دورے" کے دوران ناجو نے آصف ورما سے کہا کہ وہ اس کا جن دیکھنا چاہتی ہے نہیں تو وہ یہ ڈھونگ ختم کر دے گی۔ آصف ورما کا اس طرح بہت نقصان ہوتا۔ اُسے ظہور نے خاصی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور ناجو نے بھی اسے کہا تھا کہ وہ اسے مُنہ مانگا انعام دے گی۔ ناجو کے گھر والوں سے اسے ہر "دَورے" پر پیسے مل جاتے تھے۔ وہ لوگ اسے سچ مچ کا جن سمجھ رہے تھے۔

آخر ناجو تنگ آگئی۔ تب آصف ورما نے اُسے کہا کہ اُس کے پاس کوئی جن نہیں ہے۔ ناجو اگر اپنا کام کرانا چاہتی ہے تو اُسے خود جن بننا پڑے گا۔ اس نے ناجو کو سنایا کہ وہ دو تین عورتوں کے کام اسی طریقے سے کر چکا



ہے۔ ان میں سے ایک عورت اسی گاؤں کی تھی جس کے متعلق سب یہ کہتے تھے کہ اسے "جن پڑتے" رہے ہیں۔ یہ "جن" آصف ورما نے نکالے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس عورت پر کوئی جن قابض نہیں تھا۔ اس عورت کو ایک خاص مقصد تھا جو "جن" اور آصف ورما نے پورا کر دیا تھا۔

ناجو کو ایک تو یہ مایوسی ہوتی لیکن وہ اپنی مراد پوری کرنے کے لئے یہ ایکٹنگ کرتی رہی۔ دوسری مایوسی اُسے یوں ہوتی کہ ایک "دَورے" کے دوران جب وہ آصف ورما کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی، آصف ورما نے اُسے بتایا کہ اس کے سُسرال اسے طلاق دینے پر آمادہ ہوگئے ہیں کیونکہ وہ جن سے ڈر گئے ہیں۔ ناجو کو یہ سُن کر خوشی ہوتی لیکن آصف ورما نے اُسے کہا کہ اس نے مُنہ مانگا انعام دینے کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرے تو ناجو نے اس سے پوچھا کہ بتا کیا دوں۔ آصف ورما نے وہی انعام مانگا جو شاہ قلندر نے مانگا تھا۔ ناجو کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے آصف ورما سے کہا کہ اس کا ایک فریب تو پہلے ہی اُسے معلوم ہو چکا ہے۔ اب وہ اسے بدکاری پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہ اب یہ ڈھونگ ختم کر دے گی۔

آصف ورما نے اُسے کہا کہ وہ سب کو بتا دے گا کہ اس لڑکی پر کوئی جن نہیں آتا اور اس نے ظہور کے ساتھ تعلقات پیدا کر رکھے ہیں۔ ناجو پھر بھی اس کے جال میں نہ آئی۔ آصف ورما نے اُسے کہا کہ چلو، سوچ لو۔ تم یہ ناٹک جاری رکھو۔ میں تمہارا کام کر دوں گا چنانچہ ناٹک جاری رہا۔

"تم نے آصف ورما کا مطالبہ پورا کرنے کے بارے میں کیا سوچا تھا؟"

ناجو نے بتایا کہ وہ یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ٹال رہی تھی۔

## جب عورت چڑیل بنی

ایک روز میراثن نے ناجو کے گھر آکر اس کے کان میں کہا کہ اسے ظہور بلا رہا ہے۔ وہ موقع پیدا کر کے چلی گئی۔ ظہور سخت غصے میں تھا۔ اس نے ناجو سے کہا ـــ "مجھے آصف ورما نے بتایا ہے کہ تم طلاق لے کر اُس کے ساتھ

شادی کروگی اور اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ تم بند کمرے میں اس کی بیوی بن چکی ہو۔ اب صرف نکاح پڑھنا باقی ہے۔"

ناجو نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے ناجو سے کہہ دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کی پسند کی لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ ظہور نے اُسے ایسی بیہودہ باتیں کہہ دیں کہ ناجو بھڑک اٹھی اور وہ گھر آ گئی۔ آصف ورما نے ایسی چال چلی تھی کہ ناجو کے خواب جھوٹے ثابت ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے اوپر "جن" طاری نہ کیا۔ وہ جلتی اور کڑھتی رہی۔

"میں پاگل ہوتی جا رہی تھی" ___ اس نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ___ "ایک ہی ارادہ بار بار سامنے آتا تھا کہ آصف ورما کو قتل کر دوں۔ میرے دل سے یہ خوف تو نکل چکا تھا کہ اس کے پاس جن ہیں۔ میں رات کو بھی تڑپتی رہی مگر کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کروں۔"

ناجو ہر جمعرات کی شام کو گاؤں سے تقریباً ایک میل دُور ایک خانقاہ پر دیا جلانے جایا کرتی تھی۔ یہ اُس کی ایک مَنّت تھی۔ وہ ہر جمعرات نیا دِیا خریدتی اور اس میں تیل کی بجائے گھی ڈال کر خانقاہ پر جلا آتی تھی۔ یہ بھی جمعرات کا ہی دن تھا۔ وہ دِیا لے کر خانقاہ پر گئی۔ وہاں دو عورتیں کسی اور گاؤں کی اُسے مل گئیں۔ وہ اُن کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ اسے خیال نہ رہا کہ سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ اپنے گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔

وہ بہت تیز چل پڑی۔ راستہ لمبا تھا۔ راستہ چھوٹا کرنے کے لئے وہ اس طرف چل پڑی جہاں واردات والا کھڈ تھا۔ وہ جب برساتی نالے میں سے گزر رہی تھی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ یہ راستہ عام نہیں تھا۔ اس نے نالہ پار کیا اور جب ٹیلے کے شگاف کے قریب پہنچی تو اُسے آواز سنائی دی ___ "ناجو"___ وہ ڈر گئی کہ یہ جن یا چڑیل کی آواز ہے۔ وہ اور تیز چل پڑی مگر اسے پھر آواز سنائی دی تو اس نے رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ آصف ورما تھا جو ٹیلے کے ساتھ ساتھ اس کی طرف آ رہا تھا۔ ناجو کو معلوم نہیں تھا کہ آصف ورما اس کا تعاقب کر رہا تھا یا اتفاق سے اِدھر سے گزر رہا تھا۔ وہ ناجو کے پاس آیا اور اسے



کہا کہ وہ اپنے دَورے جاری رکھے۔ اُسے دیکھ کر ہی ناجو کا خون کھولنے لگا۔ اس شخص نے ناجو سے ظہور چھین لیا تھا۔

ناجو نے آصف ورما کو جلی کٹی سنائیں۔ آصف ورما ہنستا رہا۔ آخر بولا ___ "میں ظہور کو تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ میرے ساتھ آؤ ذرا"___ اس نے ناجو کو بازو سے پکڑا اور اُسے ٹیلے کے شگاف تک لے گیا۔ اندر گہرا کھڈ تھا۔ ناجو اس کی نیت سمجھ گئی۔ وہ رُک گئی۔ آصف ورما نے اُسے گھسیٹا۔ ناجو نے اس سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ مرد کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اُس نے آصف ورما سے کہا کہ چلو اندر، میں آتی ہوں۔

آصف ورما شگاف میں داخل ہو گیا۔ ناجو اُس کے پیچھے اندر گئی جونہی آصف ورما پیچھے مُڑا ناجو نے دونوں ہاتھوں میں اس کی گردن جکڑ لی۔ اُس نے بیان دیتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ اُس وقت انسان نہیں چڑیل بن چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سی طاقت تھی جس نے اس کے ہاتھوں کو لوہے کا پھندہ بنا دیا تھا۔ آصف ورما نے ایک ہاتھ اپنی گردن پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ناجو کی ایک کلائی پکڑ لی۔ اُس کے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ دو تین چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور ایک ٹکڑے نے آصف ورما کے ہاتھ کے دباؤ کے نیچے آ کر ناجو کی کلائی زخمی کر دی۔ آصف ورما بہت تڑپا۔ جب اس کا جسم ساکن ہو گیا تو ناجو نے اس کی گردن چھوڑی۔ وہ گر پڑا۔ ناجو کو تو یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ آصف ورما مر جاتے گا۔ وہ گرا تو یہ بھاگ آئی۔

اس نے کسی کو نہ بتایا کہ یہ واقعہ ہُوا ہے۔ وہ سوچتی رہی کہ صبح آصف ورما کیا کرے گا۔ کیا وہ اس کے خاوند کو یا اُس کے سُسر یا باپ کو بتاتے گا کہ ناجو نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ صبح ہوتی تو اسے پتہ چلا کہ آصف ورما کی لاش کھڈ میں پڑی ہے۔

کیس بڑا صاف تھا۔ ناجو کو عمر قید دی گئی۔

# باپ بیٹا

انسان کی نفسیات سمندر کی طرح ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر کیا کیا پوشیدہ ہے۔ بعض انسانوں کی بعض حرکتیں دوسروں کو حیران کر دیتی ہیں۔ اگر آپ پولیس سٹیشن میں وارداتوں کا ریکارڈ دیکھیں یا نفسیات کے کسی ڈاکٹر کی فائلیں دیکھیں تو حیرت کی حد سے بھی آگے نکل جائیں۔ یہ غلط نہیں کہ انسان اپنی اپنی نفسیات کا غلام ہے۔ ایک کیس سناتا ہوں۔ ذرا انسانی نفسیات کے کرشمے دیکھئے۔

ایک عورت میرے تھانے میں آئی۔ عمر پینتیس چھتیس سال ہو گی۔ لباس، چال ڈھال اور شکل و صورت سے خوشحال گھرانے کی معلوم ہوتی تھی خوبصورت عورت تھی۔ اپنی عمر سے کم از کم پانچ سال کم لگتی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کے محلے کے دو معزز آدمی تھے۔ عورت کا نام یاد نہیں رہا۔ یاد ہوتا بھی تو میں اصل نام نہ لکھتا۔ اُسے میں نادرہ کہوں گا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی اور لال سُرخ تھیں۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت روتی ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ نادرہ کا اکلوتا بیٹا حنیف لاپتہ ہو گیا ہے۔ یہ اُس کی واحد اولاد تھی۔ میں نے نادرہ کے لواحقین کے متعلق پوچھنے سے پہلے اُس کے بیٹے کے متعلق کچھ باتیں معلوم کرنا بہتر سمجھا۔ وہ بچہ نہیں تھا کہ اُسے کسی نے گلی میں سے اٹھا کر بوری میں ڈال لیا ہو۔ اُس کی عمر پندرہ سال اور تین مہینے بتائی گئی۔ اس عمر کے لڑکے کی گمشدگی کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ اس کیس میں ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ حنیف اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار سے بگڑا ہوا ہو گا۔ اس



کی کوئی فرمائش پوری نہ ہوتی ہو گی۔ وہ ماں کو ڈرانے کے لئے گھر سے بھاگ گیا۔ ایسے لڑکے خود ہی واپس آجایا کرتے ہیں۔

اُس زمانے میں آج کل کی طرح بچے اغوا نہیں ہُوا کرتے تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ خرکار ابھی وجود میں نہیں آتے تھے۔ عداوت کی بنا پر یا جائیداد کے تنازعہ میں کسی کا بچہ غائب کر دیا جاتا تھا۔

ایک وجہ یہ بھی ہوتی تھی کہ نوجوان لڑکے کسی کے عشق میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ جذبات کے غلبے میں گھر سے لڑکی کو بھگا لے جاتے اور ذلیل و خوار ہوتے تھے، یا لڑکی کے لواحقین کے ہاتھوں ایسے طریقے سے قتل ہوتے کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ ایسے کیس بھی اُس دَور میں بہت کم ہوتے تھے۔ وہ فلموں کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ بڑے شہروں میں دو دو چار چار پکچر ہاؤس ہوتے تھے۔ چھوٹے شہر اور قصبے اس لعنت سے محفوظ تھے، اس لئے نوجوانوں میں ابھی ہیرو بننے کا خبط پیدا نہیں ہُوا تھا۔

عمر کے پندرھویں سال سے بڑا خطرناک دَور شروع ہوتا ہے۔ جوانی کے جذبات غالب آنے لگتے ہیں۔ لڑکے کچھ ایسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں جو نارمل نہیں ہوتیں۔ لڑکے جو امیر اور آزاد ہوتے ہیں وہ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور خوار ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ حنیف اس زُمرے میں آ سکتا تھا۔

حنیف کے متعلق اُس کی ماں سے میں نے مندرجہ بالا وجوہات کے پیشِ نظر بہت کچھ پوچھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حنیف گھر سے خود نہیں بھاگا اور کسی کے ساتھ عداوت بھی نہیں۔ اُس کے متعلق یہ بھی بتایا گیا کہ اُس میں چالاکی نام کو نہیں اور یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اُس نے کسی لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہو گی یا کسی لڑکی کو گھر سے بھگا کر لے گیا ہو گا۔

نادرہ کے ساتھ محلے کے جو دو معزز شخص آئے تھے وہ واقعی معزز اور عقل مند تھے۔ وہ کہتے تھے کہ لڑکا بھولپن میں کسی کے پھندے میں آگیا ہے۔ اُنہوں نے نادرہ کی موجودگی میں کہا کہ اس ماں نے بیٹے کو اپنے ساتھ

چھپا کے رکھا ہُوا تھا۔ اسے آزادانہ طور پر مرد بننے ہی نہیں دیا۔

مجھے ایک اور خطرہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی ایک کہانی "کاغذ کے گھوڑے" میں آپ کو سنایا تھا کہ ہندوستان کے بعض راجے مہاراجے خوبصورت اور کم عمر لڑکوں کو رقص کی تربیت دلوا کر خاص تقریبوں اور ضیافتوں میں ان لڑکوں سے خاص قسم کا رقص کرایا کرتے تھے۔ یہ رقص نیم عُریاں ہو کے کیا جاتا تھا۔ جن لڑکوں کی عمر زیادہ ہو جاتی تھی اُن کی جگہ نئے لڑکے لاتے جاتے تھے۔ یہ لڑکے خریدے جاتے تھے۔ بعض والدین اپنے بچّے اچھے داموں فروخت کر دیتے تھے لیکن زیادہ تر لڑکوں کو ورغلا کر یا اغوا کر کے لے جاتے تھے۔

حنیف کے متعلق بتایا گیا تھا کہ خوبصورت لڑکا ہے۔ اُس کی جو فوٹو مجھے دکھائی گئی وہ پانچ سال پہلے کی تھی۔ اس سے اُس کی خوبصورتی کا پتہ چلتا تھا۔ میں نے اس طرف بھی توجہ دی کہ نادرہ کے ساتھ محلّے کے دو آدمی آئے تھے۔ اُس کا خاوند باپ یا کوئی بھائی ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے نادرہ سے اور بھی کئی باتیں پوچھنی تھیں اس لئے میں نے دونوں آدمیوں کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ نادرہ میرے پاس اکیلی رہ گئی۔

## نادرہ میں غرور بھی تھا

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے ساتھ اس کے گھر کا کوئی آدمی کیوں نہیں آیا؟ اُس نے جو جواب دیا اس سے میں چونک اُٹھا اور مجھے اطمینان سا ہونے لگا کہ مجھے گمشدہ لڑکے تک پہنچنے کا راستہ مل گیا ہے۔ اُس نے مجھے اپنے متعلق جو کچھ بتایا وہ مختصراً یہ تھا کہ وہ اپنے خاوند سے الگ رہتی تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ اُس کا تعلق ٹوٹ چکا تھا لیکن طلاق نہیں ہوئی تھی۔ اپنے گھر میں اُس کے تین آدمی تھے — باپ اور دو بھائی — باپ چند سال پہلے مر گیا تھا۔ باپ کی زندگی میں نادرہ کے بڑے بھائی نے اپنی پسند کی



شادی کر لی اور ماں باپ سے الگ ہو کر ساتھ والے شہر جا آباد ہُوا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آیا۔ اس سے چھوٹا بھائی لڑکپن میں ہی آوارہ ہو کر بدمعاشوں کی منڈلی میں چلا گیا تھا۔ باپ نے اسے گھر سے نکال کر عاق کر دیا تھا۔

میرے سامنے دو مشتبہ آدمی آ گئے۔ ایک تھا نادرہ کا خاوند جس سے وہ الگ ہو گئی تھی۔ اُس کے خاوند نے اپنا بیٹا اُس سے لینے کے لئے بیٹے کو ورغلا لیا ہوگا۔ دوسرا مشتبہ نادرہ کا وہ بھائی تھا جسے باپ نے جائیداد کے حصّے سے محروم کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ اُس نے انتقاماً نادرہ کے بیٹے کو غائب کر دیا ہوگا۔

مجھے ضرورت محسوس ہوتی کہ نادرہ سے اُس کے خاندانی حالات معلوم کروں۔ میں نے اُس کے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کی۔ مجھے امید تھی کہ لڑکا اس کے خاندان میں سے ہی مل جائے گا۔ میرے کہنے پر نادرہ نے جو بات سنائی وہ یوں تھی کہ سترہ اٹھارہ سال پہلے اُس کی شادی اسی قصبے کے ایک محلّے میں ہوئی تھی۔ اُس کی ڈولی گئی۔ دوسرے دن نادرہ واپس آ گئی۔ دو روز میکے رہ کر سُسرال گئی۔ سات آٹھ روز بعد پھر میکے آ گئی۔ ان دس دنوں میں ہی دونوں طرف کے والدین کی سیاست جو ہمارے معاشرے میں لازمی سمجھی جاتی ہے، عروج پر پہنچ گئی۔

اس سیاست نے یہ گُل کھلایا کہ اُس کا خاوند جو اسی شہر میں رہتا تھا اس کے میکے گھر نہ آیا۔ تین چار دنوں بعد اُس نے کسی عورت کی زبانی نادرہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ اُسے لینے نہیں آئے گا، نادرہ آجائے۔ یہ پیغام نادرہ کی ماں نے سُن لیا۔ ماں نے جواب بھیجا کہ جب تک لڑکا نہیں آئے گا نادرہ نہیں جائے گی۔ نادرہ کا خیال تھا کہ اس کی ساس بہت بُری عورت ہے۔ اُس نے بیٹے کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے اور وہ اُسے نہیں آنے دے رہی۔ نادرہ کا سُسر خاموش طبیعت والا اور اتنا بھلا مانس تھا کہ بیوی کی کوئی بھی بات اور کوئی بھی فیصلہ رَد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اِدھر نادرہ کی ماں بھی اپنا رعب داب رکھنے والی عورت تھی اور یہ اس کا باپ تو تھا ہی ریٹائرڈ صوبیدار۔ انگریزوں کی فوج کے صوبیدار سراپا مارشل لا ہوتے تھے۔ اس صوبیدار کو تو انگریزوں نے دو مربعہ نہری اراضی عطا کر رکھی تھی اور قصبے کے ساتھ بھی اُس کی آبائی زمین تھی۔ اُسے پتہ چلا کہ اُس کے داماد نے یہ حکم بھیجا ہے کہ نادرہ خود آجائے تو اُس نے مارشل لاء ریگولیشن جاری کر دیا کہ نادرہ کو اُس کا خاوند لینے نہیں آئے گا تو نادرہ نہیں جائے گی۔ وہ ساری عمر ماں باپ کے گھر بیٹھے گزار دے گی۔

نادرہ کے سسرال نے بھی مورچے پکے کر لئے۔ نادرہ میں پہلے بچے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اُس نے اپنے ماں باپ سے چوری ایک عورت کی زبانی اپنے خاوند کو پیغام بھیجا کہ بڑوں کی چپقلش میں پڑ کر وہ اپنی ازدواجی زندگی میں کانٹے نہ بکھیرے۔ ان بوڑھوں نے آٹھ دس برس بعد دنیا سے اُٹھ جانا ہے۔ پیچھے ہمیں رہنا ہے۔ تمہارے پہلے بچے کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ اس میں اپنی بے عزتی نہ سمجھو۔ آجاؤ اور میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی۔

خاوند اکھڑ طبیعت کا جوان تھا اور ماں نے بھی اُسے اپنے شیطانی اثر میں لے رکھا تھا۔ اُس نے نادرہ کو جواب بھیجا کہ تمہارے باپ کی صوبیداری مجھ پر نہیں چلے گی۔ اُسے کہو کہ وہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائے۔

نادرہ صوبیدار کی بیٹی تھی۔ خوشحال بلکہ امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اُس میں بھی صوبیداری رگ پھڑک اُٹھی۔ اُس نے اپنے خاوند کو پیغام بھیجا کہ طلاق دینا چاہو تو دے دو۔ اپنے باپ کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔ نادرہ میں غرور بھی تھا۔

## بدمعاش بھائی خوددار بہن

بے شمار زرخیز اراضی اور باپ کی صوبیداری کا غرور نادرہ کے چھوٹے بھائی میں زیادہ تھا۔ سکول میں وہ اپنے استادوں کو بھی پلے نہیں



باندھتا تھا۔ دسویں جماعت تک وہ پہنچ ہی نہ سکا۔ باپ کو اُس وقت ہوش آئی جب اُسے پتہ چلا کہ اس کا چھوٹا بیٹا بدمعاشوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ خدا نے اس خاندان کو خوبصورتی دی تھی۔ یہ لڑکا بھی خوبصورت نوجوان نکلا اور عورتوں کا شکار کھیلنے لگا۔ باپ نے اُسے مارا پیٹا لیکن وہ بدمعاشی کے اُس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ بدمعاشوں کے علاوہ وہ ایک خوبصورت اور بدنام عورت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

اس لڑکے نے گھر سے کئی بار پیسے چرائے اور چار دکانیں جو اُنہوں نے کرائے پر دے رکھی تھیں، کبھی کبھی ان میں سے ایک دو کا کرایہ وصول کر کے جُوا کھیلتا اور شراب پیتا تھا۔ اُس کی عمر اُنیس بیس سال ہو گئی تو باپ نے اُس کا علاج یہ سوچا کہ اُس کی شادی کر دی جائے۔ باپ جب اُس کے لئے رشتہ تلاش کرنے کو نکلا تو اُسے توقع تھی کہ لڑکیوں والے اُس کا شکریہ ادا کر کے اُسے رشتہ دے دیں گے مگر پہلے گھر سے ہی اُسے جواب ملا کہ اُنہوں نے اپنی بیٹی کسی بدمعاش کو دینے کے لئے نہیں پالی۔ دو اور گھروں سے بھی کورا انکار ہُوا

باپ اس قدر دل برداشتہ ہُوا کہ اُس نے بیٹے کو گھر سے نکال کر اُسے جائیداد سے عاق کر دیا۔ بیٹا تو گھر سے نکلا ہی ہُوا تھا۔ تین تین چار چار دن گھر سے غائب رہتا تھا۔

اس سے بڑے بیٹے نے نادرہ کی شادی سے پہلے اپنی ذات سے کم درجے کی ذات کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ باپ نے اُسے اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں داخل ہونے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ بیٹے نے جائیداد سے اپنا حصہ مانگا تو باپ نے اُسے کچھ رقم دے کر چلتا کیا۔ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پچاس میل دُور شہر میں چلا گیا۔ پھر وہ کبھی نظر نہ آیا۔

نادرہ کی ماں اپنے دو بیٹوں کے غم میں گھلنے لگی اور کچھ عرصہ بیمار رہ کر مر گئی۔ نادرہ کو سسرال لے جانے کے لئے کوئی نہ آیا۔ وہ خود نہ گئی۔

باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ نادرہ نے اس بیٹے کو جنم دیا جو اب پندرہ سال کی عمر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ نادرہ نے ماں کے مرنے کے بعد اپنی زندگی اپنے باپ کی خدمت اور بچے کی پرورش کے لئے وقف کر دی۔ اس سے وہ سکون محسوس کرنے لگی۔ اُس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ اسے اب باقی عمر اسی گھر میں گزارنی ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ نادرہ کے باپ نے اُسے صرف ایک بار کہا کہ بیٹی! اگر تم دوسری شادی کرنا چاہتی ہو تو میں تمہارے خاوند کو مجبور کر دوں گا کہ تمہیں طلاق دے دے۔ نادرہ نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا کہ وہ خود طلاق دے دیتا ہے تو میں قبول کر لوں گی، طلاق مانگوں گی نہیں۔ نادرہ نے مجھے بتایا کہ ابتدا میں وہ طلاق لینا چاہتی تھی لیکن اُسے اپنے خاوند کا یہ پیغام ملا کہ تم نے پہلی رات کہا تھا کہ ساری عمر تمہاری محبت کو سینے میں زندہ رکھوں گی، اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم پہلی عورت ہو جسے میرے دل اور میری روح نے قبول کیا ہے۔ زمین اور آسمان اُوپر نیچے ہو جائیں میں تم سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ اب تمہاری مرضی ہے۔ آتی ہو تو آجاؤ۔ نہیں آؤ گی تو عمر اکیلے گزار دوں گا۔ میرے گھر میں کوئی دوسری عورت نہیں آئے گی —— اور میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔

نادرہ نے اس پیغام کا جواب دیا کہ لینے آؤ گے تو اُسی وقت ساتھ چل پڑوں گی۔ خود نہیں آؤں گی۔ میرا جسم اور میری روح تمہارے لئے ہے۔ نہیں آؤ گے تو ساری عمر اکیلے گزار دوں گی۔

اس کے بعد بچہ پیدا ہوا۔

پھر بچہ بڑا ہونے لگا۔ برادری کے بزرگوں نے صوبیدار سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی خراب نہ کرے۔ اُدھر نادرہ کے سسرال سے بھی کہا کہ اپنے بچوں کی زندگی کو یوں جہنم نہ بنائیں لیکن دونوں طرف کے مورچے اتنے مضبوط تھے کہ فائر بندی پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ نادرہ نے دل اپنے بچے سے لگا لیا۔ اپنے خاوند کے متعلق اُسے اتنا ہی معلوم تھا کہ ماں باپ



کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے کہنے کے باوجود شادی سے انکار کر چکا ہے۔ نادرہ کو یہ بھی پتہ چلا کہ اُس نے اپنے ماں باپ کو دھمکی دی ہے کہ انہوں نے اُس کی شادی کی پھر کبھی بات کی تو وہ گھر سے چلا جائے گا۔

میں نے اس کہانی کی ابتدا انسانی نفسیات سے کی ہے۔ نادرہ اور اُس کے خاوند کی نفسیات ملاحظہ کریں کہ ایک دوسرے کی خاطر دوسری شادی نہیں کر رہے لیکن دونوں کا اکھڑپن قائم ہے۔ وہ اُسے لینے نہیں آرہا، یہ خود جا نہیں رہی۔

## نادرہ کے پاس حکیم آیا

یہ تو ہے چار دیواری کی دنیا کی کہانی۔ سراغرسانی کی کہانی یہ ہے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ بچہ بڑا ہو گیا، باہر جا کر کھیلنے لگا پھر سکول جانے لگا۔ کیا اس دوران کبھی ایسا ہوا ہے کہ باپ نے بیٹے کو ورغلایا ہو اور اُسے اپنے گھر لے جانے کی کوشش کی ہو؟

"نہیں" —— نادرہ نے جواب دیا —— "بچہ جب اچھا بُرا سمجھنے کے قابل ہو گیا تو میں نے اُسے باپ کے متعلق بتا دیا تھا اور اُسے ساری بات سُنا دی تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ باپ اگر باہر تمہارے ساتھ بات کرے تو تمیز سے بات کرنا لیکن اُس کے ساتھ اُس کے گھر نہیں جانا۔ میرے دل میں غصہ تو بہت تھا لیکن میں نے اپنے بیٹے کے دل میں اس کے باپ کی نفرت پیدا نہیں کی۔"

"بیٹے کا رویہ اور ردِ عمل کیا تھا؟"

"میری بات سن کر کہنے لگا کہ مجھے لڑکوں نے بتایا تھا کہ وہ شخص تمہارا باپ ہے" —— نادرہ نے جواب دیا —— "میرے بیٹے نے کہا کہ امی جان! مجھے پہلے ہی معلوم ہے کہ وہ میرا باپ ہے اور جو بات آپ نے سنائی ہے وہ مجھے تھوڑی تھوڑی لڑکوں سے معلوم ہو گئی تھی۔ میں آپ سے پوچھتے ڈرتا تھا۔

مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔ اگر وہ اچھا ہے تو آپ کو اور مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتا؟ .... میں نے بیٹے سے کہا کہ ایسا نہ کہو کہ وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا لیکن اُس کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔"

مجھے نادرہ کی ازدواجی زندگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکے کی گمشدگی میں باپ کا ہاتھ تو نہیں؟ گر ایسا ہے تو میں رپورٹ لکھے بغیر نادرہ کے خاوند سے لڑکا لے لوں اور انہیں کہوں کہ پولیس اور کچہری کے چکر سے بچیں، لیکن نادرہ نے میرے ایک سوال کے جواب میں پوری کہانی سنا ڈالی۔ اس کہانی کا ایک حصّہ بڑا ہی جذباتی ہے۔ وہ میں سراغرسانی سے ہٹ کر آپ کو ضرور سُناؤں گا۔

"باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی" — نادرہ نے کہا — "ایک روز میرے بیٹے نے گھر آکر مجھے سنایا کہ اُس نے ایک لڑکے کو مارا پیٹا تو ایک اور لڑکا میرے بیٹے پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں لڑکوں نے میرے بیٹے کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکے کے باپ نے دیکھ لیا۔ وہ دوڑا آیا اور اُس نے دونوں لڑکوں کی پٹائی کر دی۔ اُن دونوں کے باپ اور بھائی وغیرہ آگئے لیکن لڑائی جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کسی نے میرے خاوند کو طنزیہ کہا کہ تمہارا اس لڑکے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میرے خاوند نے گرج کر کہا کہ کسی نے اس لڑکے (میرے بیٹے) کو میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا۔ آدمی رُعب اور جرأت والا ہے۔ اُس کی گرج سُن کر سب چُپ ہو گئے۔ میرے بیٹے کے ساتھ اُس نے پھر بھی کوئی بات نہ کی ....

"ابھی ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ میرے بیٹے کو پیٹ میں کچھ تکلیف ہو گئی۔ میرے اباجان فوت ہو چکے تھے۔ میں ہندو ڈاکٹر کو گھر لائی۔ اُس نے دوائیاں دیں لیکن تین دن تک آرام نہ آیا۔ پھر میں ہسپتال کے ڈاکٹر کو لائی۔ اس کا علاج بھی بیکار جانے لگا۔ ایک روز ایک آدمی میرے گھر آیا۔ کہنے لگا کہ میں حکیم ہوں، سُنا ہے کہ تمہارے بیٹے کو کوئی ایسی بیماری ہے جو ڈاکٹروں کے ہاتھ بھی نہیں آتی۔ میں بچے کے علاج کے لئے آیا ہوں ....



"مجھے بچے کی بیماری نے پریشان کر رکھا تھا۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ حکیم اتنا نیک ہے کہ اپنے آپ آ گیا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ دوائی دے۔ اُس نے میرے بیٹے کی نبض دیکھی، پیٹ دبا کر دیکھا، کچھ پوچھا اور چلا گیا۔ وہ دوائیاں لے آیا جو اُس نے اپنے ہاتھ سے دیں۔ میں نے اُس سے پیسے پوچھے تو کہنے لگا کہ پہلے بچہ ٹھیک ہو لے ....

بچے کو دوسرے ہی دن افاقہ ہو گیا۔ حکیم آیا اور دوائی دے کر چلا گیا۔ تیسرے دن میرا بیٹا بالکل ٹھیک ہو گیا۔ شام کو حکیم آیا تو اُس نے کہا کہ اب دوائی کی ضرورت نہیں۔ اُس نے پرہیزی غذا بتا کر کہا کہ دو روز یہ کھلاؤ پھر جو جی میں آئے کھائے .... میں نے حکیم سے کہا کہ وہ پیسے بتائے۔ اُس نے مُسکرا کر کہا کہ ضروری نہیں ہر مریض سے پیسے ہی لئے جائیں۔ میں پیسوں کی خاطر نہیں آیا تھا .... مجھے غصّہ آ گیا جو میں نے اس لئے دبا لیا کہ اس شخص نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"غصّے کی کیا وجہ تھی؟" — میں نے پوچھا اور اُسے کہا — "معلوم ہوتا ہے تم میں غرور اور جھوٹا وقار زیادہ ہے۔"

اُس نے غصّے کی وجہ یہ بتائی کہ اس واقعہ سے دو سال پہلے جب اُس کی عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی اُس کا باپ مر گیا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس کا ایک بھائی اپنی پسند کی شادی کر کے ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا اور دوسرا بھائی غنڈوں بدمعاشوں کی دنیا میں گم ہو چکا تھا۔ گیارہ بارہ سال گزر گئے تھے۔ باپ نے اپنی تمام جائیداد نادرہ کے نام اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ یہ جائیداد معمولی نہیں تھی۔ نادرہ جاگیردارنی اور بہت بڑی چوہدرانی بن گئی تھی۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی اور جوان بھی تھی۔ اُسے دیہات کے شہزادوں اور نوابوں کے پیغام ملنے لگے کہ وہ خاوند سے طلاق لے لے اور اُن سے شادی کر لے۔ نادرہ نے ہر ایک کو صرف انکار نہ کیا بلکہ انہیں توہین آمیز الفاظ میں دُھتکار دیا تھا۔

اس حکیم نے جب اُسے کہا کہ ضروری نہیں کہ ہر مریض سے پیسے

لے جائیں تو نادرہ کچھ اور سمجھی۔ حکیم بڑا اچھا لباس پہنے ہوتے تھا اور ڈیل ڈول سے بارعب اور پُرکشش تھا۔ نادرہ کو خیال آیا کہ یہ حکیم اسے تنہا، خوبصورت اور مجبور عورت سمجھ کر اُس کے بیٹے کا علاج کرنے آیا تھا اور اب اپنی پسند کا انعام مانگتا ہے۔ نادرہ نے اُسے ایک بار کہا کہ وہ پیسوں کی صورت میں دوائیوں کی قیمت ادا کرے گی اور دُگنی قیمت دے گی۔ حکیم نے مسکراتے ہوتے کہا کہ تم پیسوں کو ہی دولت سمجھتی ہو۔ ہم انسانوں کے پیار کو خزانہ سمجھتے ہیں۔

نادرہ نے اُسے دھتکارا نہیں اور اُس نے غصّہ بھی دباتے رکھا لیکن اُس کے لہجے سے حکیم جان گیا کہ یہ عورت کیا سمجھ رہی ہے۔ نادرہ نے اُسے کہا ۔۔۔ "میں بڑے بڑے نامی گرامی جاگیرداروں کو ٹھکرا چکی ہوں جو بیس بیس گاؤں کے مالک ہیں .... آپ مجھ سے پیسے لیں۔ میری عزت اتنی سستی نہیں اور آپ اپنی عزت کا بھی خیال رکھیں۔"

نادرہ نے مجھے بتایا کہ حکیم کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اُس نے کہا ۔۔۔ "چوہدرانی! ہوش میں آ۔ اس زمین پر اور اپنے حسن جوانی پر اتنا مان نہ کر۔ زمین اللہ کی ہے اور حسن جوانی قبر کے کیڑوں کی خوراک ہے۔ میں نے تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ مجھے پیسے مل گئے ہیں۔ میں فرشتہ نہیں کہ تیرے بیٹے کا علاج کرنے ویسے ہی چلا آیا تھا۔ تیرا خاوند میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میری بیوی کے پاس جاؤ۔ اُس کا بیٹا بیمار ہے اور ڈاکٹروں کی دوائیاں فیل ہوگئی ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ خود کیوں نہیں اپنی بیوی کے پاس جاتا۔ اُس نے مجھے وجہ بتادی۔ میں اس شخص پر حیران ہوں کہ گیارہ بارہ برسوں کی علیحدگی کے باوجود اُس کے دل میں اپنی بیوی اور اپنے بچے کی اتنی محبت ہے۔"

حکیم جانے کے لئے اُٹھا اور بولا ۔۔۔ "غرور نہ کر چوہدرانی! خاوند کے بغیر عورت کی کوئی ذات نہیں۔ دیکھ ذرا تیری حالت کیا ہوگئی ہے۔ کوئی غیر مرد تیری ہمدردی کی بات کرتا ہے تو تیرے دماغ میں یہ وہم آجاتا ہے کہ یہ تم پر مرتا ہے اور تیری چاہت رکھتا ہے۔ ایک نہ ایک دن خدا تجھے ایسا



جھٹکا دے گا کہ تُو دوڑی اپنے خاوند کے پاس جاتے گی اور اُسے کہے گی کہ میری ساری جائیداد لے لو اور مجھے اپنی پناہ میں لے لو۔"

نادرہ نے یہ بات مجھے سناتے ہوتے کہا ۔۔۔ "حکیم چلا گیا تو میں رونے بیٹھ گئی۔ بہت روتی اور ایک ہی بات دل میں آتی تھی کہ اپنے خاوند کو پیغام بھیجوں کہ میرے گھر میں آجاؤ اور ہم یہیں رہیں گے مگر وہ اکھڑ آدمی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ نہیں آئے گا۔ میرے دماغ میں غرور کا کیڑا ہلنے جلنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جہاں بارہ سال گزر گئے ہیں وہاں باقی عمر بھی گزر جاتے گی۔ میں اپنے باپ کی قبر کی بے عزتی نہیں ہونے دوں گی۔"

اپنے جھوٹے وقار اور اپنے باپ کی قبر کی مٹی کو "بے عزتی" سے بچانے کے لئے نادرہ اتنے بڑے امتحان سے گذر رہی تھی۔

## نادرہ کے مراسم اس شخص کے ساتھ

میں نے نادرہ سے یہ پوچھا تھا کہ اس کے خاوند نے کبھی اُس کے بیٹے کو ورغلانے اور اپنے گھر لے جانے کی کوشش کی تھی؟ نادرہ نے جواب میں اتنی لمبی کہانی سنادی۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ باپ کے دل میں اپنے بیٹے کی بہت زیادہ محبت تھی۔ آپ کو جو دو واقعات سناتے ہیں ان سے اس محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ نادرہ نے یہ بھی بتایا کہ اُسے پتہ چلا ہے کہ اُس کا بیٹا باہر میدان میں کھیل رہا ہوتا ہے تو باپ دُور کھڑا اُسے دیکھتا رہتا تھا۔

اس شخص کو میں کسی حد تک مشتبہ سمجھنے لگا۔ دوسرا مشتبہ نادرہ کا بدمعاش بھائی تھا۔ میں نے محرّر کو بلا کر پوچھا کہ اس نام کا کوئی بدمعاش تھانے کے ریکارڈ پر ہے؟ اُس نے ریکارڈ دیکھے بغیر بتایا کہ اُس کا نام نعمت علی ہے اور علیا کے نام سے تھانے کے ریکارڈ پر ہے۔ سزا یافتہ نہیں۔ جوئے باز ہے۔ لڑائی مار کٹائی میں ماہر ہے۔ چوری کی دو اور دو ڈکیتی

کی وارداتوں میں مشتبہ بٹھایا گیا تھا لیکن اُس کے خلاف کچھ نہیں ملا۔ یہ اُس وقت کی دو وارداتیں تھیں جب میں اس تھانے میں نہیں آیا تھا۔ محرّر نے بتایا کہ اس قصبے میں یا تھانے کے علاقے میں کچھ دنوں کے لئے آتا ہے۔ زیادہ تر ساتھ والے تھانے کے علاقے میں رہتا ہے۔ اس علاقے کے دو ڈکیت مشہور تھے۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ علیا بدمعاش کو ڈھونڈ کر تھانے میں لے آئے خواہ دوسرے تھانے کے علاقے سے لانا پڑے۔

"یہ بتاؤ نادرہ! کہ باپ نے جب اپنی تمام جائیداد تمہارے نام کر دی تھی تو اس بھائی نے یا دوسرے بھائی نے تمہیں کہا تھا کہ جائیداد کا حصّہ دو؟"

"وہ تو اپنے باپ کی وفات پر بھی نہیں آئے تھے" — اُس نے جواب دیا — "مجھے توقع تھی کہ میرے بھائی آئیں گے اور میرے سر پر ہاتھ رکھیں گے اور میں انہیں جائیداد میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور دوں گی۔"

"تمہارا بھائی نعمت علی تمہیں کبھی نظر نہیں آیا؟"

"ان بارہ تیرہ برسوں میں تین چار دفعہ دیکھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "ہر بار مجھے دیکھ کر وہ میرے پاس آگیا اور بڑی سنجیدگی سے گھر کا حال احوال پوچھا اور چلا گیا۔ دو مرتبہ میرا بیٹا بھی میرے ساتھ تھا۔ آخری مرتبہ وہ ابّو کی وفات کے چھ سات ماہ بعد ملا۔ اُس نے میرے بیٹے کے سَر پر ہاتھ پھیرا۔ میں اُسے دیکھ کر رو پڑی کیونکہ ابّو فوت ہو چکے تھے۔ اُس نے کہا — 'اللہ مالک ہے نادرہ! اتنا غم نہ کر۔ بیٹے کا خیال رکھا کر' — میں اُسے کہنا چاہتی تھی کہ نعمت! بدمعاشی سے توبہ کرو اور گھر آجاؤ۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں، لیکن میرا دل اتنا بھر آیا تھا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔"

اس کے باوجود کہ نادرہ نے اپنے اس بھائی کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی، میں اُسے مشتبہ سمجھتا تھا۔ نادرہ نے جب یہ کہا کہ اُس نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ گھر آجاؤ میں اکیلی ہوں تو مجھے خیال آیا کہ اس عورت کی دو مربعہ اراضی



نہری علاقے میں ہے اور کچھ قصبے کے ساتھ ہے اور دکانیں بھی کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ اکیلی عورت سارے انتظامات کس طرح سنبھالتی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ پوچھنے کی وجہ یہ تھی اس کے مزارعے ہوں گے اور اس نے کچھ زمین بٹائی پر دی ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی مزارعہ کو بے دخل کر دیا ہو یا کسی سے بٹائی کی زمین واپس لے لی ہو۔ ایسے موقعوں پر بعض مزارعے یا بٹائی پر کاشتکاری کرنے والے مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں۔ انتقام کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نے اس کے اکلوتے بیٹے کو اغوا کر لیا ہو یا کسی کو اس نے کرائے کی دکان سے زبردستی بے دخل کیا ہو تو اُس نے اس کے بچّے کو غائب کر دیا ہو۔

"میرے دُور پار کے رشتہ داروں میں ایک آدمی ہے جو زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے" — نادرہ نے جواب دیا — "نہری علاقے میں اُس کی بھی زمین ہے۔ میری زمین کے سارے کام اُس نے اپنے ذمّے لے رکھے ہیں۔"

"کیا تم نے یا اُس نے کسی مزارعہ کو بے دخل کیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "یا زمین کے متعلق پانی لگانے پر کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے؟"

"اُس نے شاید کیا ہو" — نادرہ نے جواب دیا — "میں نے اُس کے کاموں میں کبھی دخل نہیں دیا۔"

یہ ایک اور آدمی تھا جو میرے سامنے آگیا۔ میں ہر شخص کو پولیس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نادرہ سے اس شخص کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے اس کا نام لطیف بتایا۔ نادرہ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ خوشحال زمیندار اور رُعب داب والا تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جو نادرہ کے گھر آتا جاتا تھا۔ اُسے نادرہ کی زمین کی دیکھ بھال اور فصل وغیرہ کے کاموں کی اُجرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمدردی کی خاطر یہ کام کرتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اتنے دُور پار کے رشتہ دار کو اس عورت کے ساتھ کیوں ہمدردی ہوتی؟ میں نے اور زیادہ کریدا تو پتہ چلا کہ وہ اچھا خوبرو آدمی ہے اور ہنس مکھ ہے۔ اُس کی بیوی ہے اور تین بچّے ہیں۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اُس کی بیوی واجبی سی شکل کی عورت ہے جو

غصے کی تیز ہے۔ اُسے ہنسنا کھیلنا یا پیار سے بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہی نہیں۔

میرے ذہن میں کئی سوال آتے۔ ایک شک یہ پیدا ہوا کہ یہ رقابت کا معاملہ ہے۔ نادرہ نے بڑے بڑے جاگیرداروں کے شادی کے پیغام غرور سے ٹھکرا دیئے تھے اور اس آدمی کے ساتھ اتنے گہرے مراسم پیدا کر رکھے تھے کہ وہ اس کی ساری اراضی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ نادرہ کے کسی اُمیدوار نے اُسے اپنا بنانے کے لئے اُس کے بیٹے کو اغوا کرا دیا ہوگا۔

## مُنہ بولے بہن بھائی مگر...

میں نے نادرہ کو اپنے دفتر میں بیٹھا رہنے دیا اور باہر جا کر اُن دو آدمیوں کو بلایا جو نادرہ کے ساتھ آئے تھے۔ اُن سے لطیف کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُنہیں کہا کہ وہ مجھے بالکل صحیح بات بتائیں اور صحیح رائے دیں۔ اُنہوں نے وہی باتیں بتائیں جو نادرہ مجھے بتا چکی تھی اور اپنی رائے ان الفاظ میں دی —— "بند دروازوں کے پیچھے کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لطیف اور نادرہ مُنہ بولے بہن بھائی ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ انسان بڑی کمزور چیز ہے .... نادرہ کو ہم سب اچھی عورت کہا کرتے ہیں کیونکہ ہر کسی کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی ہے۔ غریبوں کی مدد کرتی ہے۔ کسی غریب اور نادار کی بیٹی کی شادی ہو تو اُس کا آدھا جہیز بنا دیتی ہے، لیکن آخر انسان ہے سولہ سترہ برسوں سے خاوند کے بغیر زندگی گزار رہی ہے۔ دھن دولت والی بھی ہے۔"

یہ تو ابتدائی کارروائی تھی جو میں کر رہا تھا۔ میرے مخبر بہت ہوشیار تھے۔ لوگوں کے بند دروازوں کے پیچھے کی باتیں بھی سُن لیتے تھے مجھے ابھی معلوم نہیں کس کس کی خفیہ رپورٹ لینی تھی۔ میں نے لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی۔ دوسرے تھانوں کو اطلاع دینے کے لئے محرّر سے کہا کہ کاغذی کارروائی مکمل کر لے۔ گمشدگی کی تفتیش شروع کرنے سے پہلے پولیس



کو لمبی چوڑی کاغذی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ وہ محرّر کے سپرد کی کہ مکمل کرے اور میں نادرہ کے ساتھ اُس کا گھر اور گردو نواح دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

لڑکا صبح دس بجے کے لگ بھگ گھر سے کھیلنے کے لئے باہر گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ اُس روز سکول بند تھے۔ شاید اتوار تھا۔ میں نے گھر دیکھا۔ گلی دیکھی۔ اس گلی کے درمیان سے ایک گلی بائیں کو جاتی تھی۔ پانچ گھروں بعد گلی ایک میدان میں ختم ہوتی تھی۔ میدان سے آگے کھیت تھے اور کھیتوں سے آگے بنجر علاقہ۔

اس گلی کے گھروں کے چند ایک آدمی اور کچھ بچے تماشہ دیکھنے کے لئے باہر آ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ پرسوں دس بجے کے لگ بھگ ان میں سے کسی نے حنیف کو کسی کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں میدان سے آگے چلا گیا۔ ایک پگڈنڈی میدان میں سے ہوتی ہوئی کھیتوں میں سے گزر کر آگے چلی جاتی تھی۔ کھیتوں میں چند ایک آدمی کام کر رہے تھے۔ اُنہیں بلا کر پوچھا کہ پرسوں دس بجے کے لگ بھگ یہاں کوئی تانگہ، یکّہ یا گھوڑا گزرا ہوگا اور پندرہ سال کے ایک لڑکے کو اس پر لے جایا گیا ہوگا۔ ان میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

میں تھانے چلا گیا۔ مجھے مشتبہ افراد کو بلانا تھا۔ نادرہ کا بھائی علیا نہیں ملا تھا۔ وہ قصبے میں نہیں تھا۔ اُسے لانے کے لئے دو کانسٹیبل بغیر وردی بھیج دیئے گئے تھے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ نادرہ کے خاوند کو ساتھ لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل ابھی تھانے سے نکلا ہی تھا کہ ایک دراز قد، بڑے صاف سُتھرے رنگ اور دلکش چہرے مہرے والا آدمی آیا۔ اُس نے بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی۔ عمر چالیس سے کچھ کم ہی لگتی تھی۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا اور نام لطیف بتایا۔ اُسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ نادرہ کے خاوند کے بعد مجھے اسے بھی بلانا تھا۔

"میں باہر گیا ہوا تھا" —— اُس نے کہا —— "ابھی ابھی واپس آیا ہوں اور پتہ چلا ہے کہ نادرہ کا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں اپنی زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ کیا

خیال ہے آپ کا، لڑکا مل جائے گا؟"

"سچے دل سے ڈھونڈو تو خدا بھی مل جاتا ہے"— میں نے کہا —"میں جن بھوت تو نہیں۔ آپ نے مدد کی تو لڑکا مل جائے گا۔"

یہ تھا وہ واحد شخص جو نادرہ کے گھر آتا جاتا اور اُس کے سارے کام کرتا تھا۔ میں نے نادرہ کو دیکھا تھا۔ خوبصورت عورت تھی۔ اب اس شخص کو دیکھ رہا تھا یہ بھی خوبرو اور تنومند آدمی تھا۔ نادرہ کو یہ آدمی اچھا لگنا چاہیئے تھا۔ اس کی پسند اچھی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ نادرہ اسی آدمی کی خاطر خاوند کے پاس نہیں جاتی۔

میں نے اس شخص سے پوچھا کہ وہ کس پر شک کرتا ہے۔ اُس نے کسی پر بھی شک ظاہر نہ کیا۔ نادرہ کے خاوند کے متعلق اُس نے کہا کہ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا نہ وہ ایسی ذہنیت کا آدمی ہے۔ میں نے جس طرح نادرہ کے آگے وہ تمام وجوہات رکھی تھیں جن کی بنا پر لڑکے گھروں سے بھاگتے ہیں اور میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ ان میں اُس کے بیٹے کے غائب ہونے کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے، اسی طرح میں نے لطیف کو یہ ساری وجوہات بتا کر اُس سے پوچھا کہ لڑکا کیوں اور کس طرح لاپتہ ہُوا ہو گا۔

لطیف نے نادرہ کی طرح ہر ایک وجہ پر لکیر پھیر دی۔ میں اُس پر جرح بھی کرتا رہا اور تبادلۂ خیالات بھی۔ اُس کی باتوں میں خود اعتمادی تھی۔ ذرا سی بھی جھجک نہیں تھی۔ میں نے اُس پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

"دیکھو لطیف بھائی!"— میں نے کہا —"میں تھانیدار ہوں۔ مجھے ایک گمشدہ لڑکا تلاش کرنا ہے۔ یہ میری سرکاری ڈیوٹی ہے۔ اگر میں اس میں کوتاہی کروں گا تو میری نوکری یا ترقی چلی جائے گی۔ آپ بہت شریف انسان ہو سکتے ہیں لیکن پولیس ہر کسی کو کچھ اور نظروں سے دیکھا کرتی ہے۔ میں آپ سے ایسی باتیں پوچھوں گا جو آپ کو اچھی نہیں لگیں گی لیکن آپ کو میری ہر بات کا جواب دینا پڑے گا۔ اگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ آپ نے کوئی بات مجھے غلط بتائی تھی تو یہ آپ کا جرم ہو گا اور میں آپ کو گرفتار کر سکتا ہوں۔"




"نادرہ اور اُس کے بیٹے کے متعلق میں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا"— اُس نے کہا —"آپ پوچھیں کیا پوچھتے ہیں۔"

"نادرہ کے بیٹے کی گمشدگی کا باعث آپ ہیں"— میں نے کہا۔

وہ جیسے تڑپ اُٹھا ہو۔ بولا —"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ لڑکا جوان ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے"— میں نے کہا —"لیکن وہ چھوٹا ہے اور جس طرح مجھے بتایا گیا ہے کہ بھولا بادشاہ ہے اور اس میں چالاکی نہیں۔ وہ آپ کے اور اپنی ماں کے خلاف کچھ نہیں کر سکا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ گھر سے بھاگ جائے اور اپنے آپ کو کہیں ختم کر دے۔ اگر وہ ریل گاڑی کے نیچے آ کر اپنے آپ کو ہلاک کرتا تو تھانے میں اطلاع مل جاتی۔ وہ دریا میں ڈوب مرا ہو گا۔"

"اوہ ...!" اُس نے حیران ہو کر کہا —"آپ ایک بے بنیاد شک میں پڑ گئے ہیں۔"

"اور سُنو لطیف بھائی!"— میں نے کہا —"نادرہ کو اُس کے خاوند نے اپنے گھر نہیں بسایا لیکن طلاق بھی نہیں ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے آپ کے ساتھ دوستی لگا لی ہے تو اُس نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنے بیٹے کو اس گھر سے اُٹھا لے۔"

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر گھبراہٹ نہیں غصہ تھا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔

"کیا ایسا نہیں ہُوا کہ آپ نے نادرہ کے کسی اور اُمیدوار کو کوئی طعنہ دیا اور اُس نے نادرہ کے بیٹے کو غائب کر دیا؟"

"نہیں"— اُس نے غصے میں بڑی دبنگ آواز میں کہا اور اُس نے مجھے آپ کہنا بھی چھوڑ دیا۔ میری طرف جھُک کر اور انگلی کا اشارہ میری طرف کر کے بولا —"تم خوش قسمت ہو کہ تھانیدار ہو اور تھانے میں بیٹھے ہو۔ اگر تم تھانے کے احاطے سے باہر یہ بات کہتے تو ..." وہ دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔

میں غصّے کے جواب میں غصّے سے بولنے والا تھانیدار نہیں تھا۔ اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھ کر میں نے تفتیش میں معجزوں جیسی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

"نادرہ کے ساتھ تمہاری کیا دلچسپی ہے؟"

"وہ میری مُنہ بولی بہن ہے" — اُس نے کہا — "اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے اس کی صورت، اس کا قدبُت، اس کی باتیں اور اس کی عزت مندی بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اس کے لئے ہر قربانی کر سکتا ہوں اور کروں گا۔ مجھے صرف یہ پتہ چل جائے کہ لڑکا کس کے پاس ہے۔ پھر وہاں کسی تھانیدار کی اور کسی مجسٹریٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں خود ہی تھانیدار ہوں گا اور خود ہی مجسٹریٹ ہوں گا .... جنابِ عالی! نادرہ بہت ستھرے اخلاق کی عورت ہے۔ غلط فہمی دل سے نکال دیں۔"

"لطیف یار!" — میں نے مسکراتے ہوئے کہا — "اس وقت مجھے ہی تھانیدار رہنے دو۔ مجھے بتاؤ کہ نادرہ کے خاوند کے ساتھ تمہاری کبھی بات ہوتی ہے؟"

"ہوتی رہتی ہے" — اُس نے کہا — "مجھ سے پورا جواب سُن لیں۔ لوگوں کے دل گندے ہیں۔ مجھ پر اور نادرہ پر لوگوں نے پیٹھ پیچھے شک کئے تھے۔ اب بھی کرتے ہیں۔ ایک روز نادرہ کے خاوند نے مجھے کہا کہ میں نادرہ کے گھر نہ جایا کروں۔ اب اُن باتوں کو جانے دیں جو میرے اور اُس کے درمیان ہوئیں۔ وہ بڑا دل گُردے والا آدمی ہے۔ میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ نادرہ کو میں نے بہن بنا رکھا ہے .... مجھے لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہیں۔"

## ماں کا کردار

اس شخص سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ وہ مجھے کہنے آیا تھا کہ میں تفتیش میں کوتاہی نہ کروں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں لڑکا برآمد کرا دوں تو وہ مجھے دل کھول کر انعام دے گا۔



وہ چلا گیا۔ نادرہ کا خاوند آ گیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور پوچھا کہ اُس کا کیا خیال ہے کہ لڑکے کو کس نے اغوا کیا ہو گا۔ اُس نے کہا کہ وہ کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

"معلوم نہیں آپ کو کسی نے بتایا ہے یا نہیں کہ میں نادرہ کا خاوند تو ہوں لیکن ہم علیحدہ رہتے ہیں" — اُس نے کہا — "مجھے پتہ چلتا رہتا تھا کہ نادرہ نے لڑکے کو شہزادہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے لڑکے کی کوئی بات پوری نہیں کی ہو گی اس لئے وہ گھر سے بھاگ گیا۔"

"آپ نے کبھی سوچا تھا کہ اپنے بیٹے کو آپ لے جائیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

میں نے اُسے مشتبہ سمجھ کر کئی اور باتیں پوچھیں۔ وہ تاڑ گیا۔

"آپ مجھے سیدھے الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو مجھ پر شک ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کے لئے چھپا لیا ہے؟" — اُس نے کہا — "یہ شک دل سے اُتار دیں۔ اگر میری یہ خواہش ہوتی تو میں لڑکے کو کچی عمر میں اُٹھا لیتا جب وہ تھوڑے دنوں میں ماں کو بھول سکتا تھا۔ اب اُس کی عمر پندرہ سولہ سال ہو گئی ہے۔ میں اُسے اغوا کرا سکتا ہوں، اپنے پاس نہیں رکھ سکتا .... بات یہ ہے جناب! میں لڑکے کی ماں کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔ اُس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُس کے باپ کے مرنے کے بعد میرے دل میں آئی تھی کہ اُس کے پاس چلا جاؤں یا اُسے لے آؤں کیونکہ وہ اکیلی تھی لیکن اس خیال سے چپ رہا کہ وہ کہے گی کہ میرے دل میں اُس کی زمین جائیداد کا لالچ ہے۔"

"لالچ کو گولی مارو یار!" — میں نے اُکتاتے ہوئے لہجے میں کہا — "میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کہ تم نادرہ کے متعلق کیا سوچتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے کوئی اشارہ دو کہ میں لڑکے کو برآمد کروں۔"

اُس کے ساتھ کچھ اور باتیں ہوئیں لیکن وہ کوئی اشارہ نہ دے سکا۔ البتہ میں اُسے بے گناہ سمجھنے لگا۔ اپنے بیٹے کی گمشدگی پر وہ بہت بھڑکا ہُوا تھا

اور جذباتی بھی بہت تھا۔ میں نے لطیف کا ذکر کیا کہ وہ نادرہ کے سارے کام کرتا ہے اور اُس کے ہاں جاتا بھی ہے۔

"میں نادرہ کو بھی جانتا ہوں اور لطیف کو بھی"—اُس نے کہا—"آپ مجھے نہیں جانتے۔ اگر مجھے ذرا سی بھی خرابی نظر آتی تو میں اس وقت دو قتل کے جُرم میں پھانسی چڑھ چکا ہوتا۔"

بعض لوگوں کے اندر سے اپنے مطلب کی بات نکلوانے کے لئے گپ شپ کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی کی باتیں شروع کر دیں۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ نادرہ کو تم اپنے گھر نہیں لے جاتے اور تم نے دوسری شادی بھی نہیں کی"—میں نے اُسے کہا—"یہ تو دماغی خرابی والی بات نظر آتی ہے۔ اتنی خوبصورت عورت کو تم نے چھوڑ کیوں رکھا ہے؟"

اُس نے آہ بھری اور سر جُھکا لیا۔ سر اُٹھا کر اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا—"دماغی خرابی ہی کہہ لیں، لیکن بات کچھ اور ہے .... میں انتقام لے رہا ہوں۔"

"نادرہ سے؟"

"نہیں"—اُس نے کہا—"اپنی ماں سے .... میرا باپ نادرہ کے باپ سے چار سال پہلے مر گیا تھا۔ اُسے میری ماں اپنا نوکر سمجھتی تھی۔ فیصلے اپنے چلاتی تھی۔ میں اُس وقت کچے ذہن کا نوجوان تھا جب میری شادی ہوئی تھی۔ پہلے ہی دن میری ماں نے میرے دماغ میں ڈال دی تھی کہ بیوی پاؤں کی جُوتی ہوتی ہے، حالانکہ اُس نے اپنے خاوند کو پاؤں کی جُوتی بنا رکھا تھا۔ وہ میری ماں تھی۔ میں نے اُس کا اثر قبول کیا۔ نادرہ اپنے گھر گئی اور واپس آ گئی۔ میری ماں نے میرے کانوں میں اُس کے خلاف باتیں ڈالنی شروع کر دیں۔ ایک طرف میری جوانی کے جذبات تھے دوسری طرف ماں کا پیار اور احترام تھا۔ میں پانچ سات دنوں میں ہی تنگ آ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی ....

"نادرہ کو میری ماں نے بہت تنگ کیا۔ دُودھ مکھن کی گھر میں کیا کمی تھی۔



میری ماں نے اُسے کبھی دُودھ کا ایک قطرہ مُنہ میں نہیں ڈالنے دیا تھا۔ نادرہ مجھے کہہ کر کہ چار پانچ دن کے لئے میکے جاؤں گی، چلی گئی۔ میں نے ایک روز ماں سے کہا کہ میں نادرہ کو لینے جا رہا ہوں۔ ماں نے مجھے ایسی ایسی باتیں کہیں کہ میں چکرا گیا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ میری ماں نے میری طرف سے نادرہ کو پیغام بھیجا تھا کہ آنا ہے تو خود آ جاؤ، میں نہیں آؤں گا۔ اُدھر سے نادرہ کا جواب آیا تو میں گھر نہیں تھا۔ ماں نے مجھے بتایا کہ نادرہ نے پیغام بھیجا ہے کہ میں غیرت مند باپ کی بیٹی ہوں۔ اپنے گھر میں بوڑھی ہو کر مر جاؤں گی، تم جیسے بھوڑدلوں کے گھر نہیں آؤں گی۔"

اُس نے اس قسم کی بہت سی باتیں سُنائیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ اُس کی ماں کی شیطانی سیاست کام کرتی رہی ہے۔ نادرہ کے خاوند نے اپنی ماں کا اثر قبول کیا اور اسے بہت دیر بعد ہوش آئی۔ اُس وقت تک نادرہ، اُس کی ماں اور اُس کا صوبیدار باپ اس مسئلے کو اپنی غیرت اور اپنے وقار کا مسئلہ بنا چکے تھے۔ اس کے جواب میں نادرہ کے خاوند نے بھی ازدواجی زندگی کو اپنے وقار پر قربان کر دیا لیکن نادرہ کو اُس نے اپنے دل سے اُتارا نہیں۔

نادرہ کی ساس نے جب دیکھا کہ بہو تو ہاتھ سے نکل گئی ہے تو وہ پریشان ہونے لگی۔ پھر نادرہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو ساس کے دل کو تکلیف ہونے لگی۔ نادرہ کا باپ اثر و رسوخ اور رُعب داب والا آدمی تھا اس لئے لوگ اُس کی بات کا اثر زیادہ قبول کرتے تھے۔ لوگوں نے نادرہ کی ساس کو مجرم قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساس کے دل میں پوتے کی محبت تڑپنے لگی۔

"ماں نے مجھے کہنا شروع کر دیا کہ نادرہ کو لے آؤ"—نادرہ کے خاوند نے مجھے سنایا—"تین ساڑھے تین سال گزر چکے تھے۔ میں نے اپنا وقار سامنے رکھ لیا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ میری ماں کے دل کو بہت تکلیف ہو رہی ہے کہ اُس نے اپنے بیٹے کا گھر آباد نہیں ہونے دیا۔ میرے اندر اتنا غصہ بھرا ہُوا تھا کہ میں نے ماں کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ میں نے کہا کہ

میں نادرہ کو نہیں لاؤں گا۔"

وقت گزرتا گیا اور وہ وقت آیا کہ ماں نے رو رو کر نادرہ کے خاوند سے کہا کہ بیٹا! میں تمہیں اس طرح اُجڑا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارا گھر آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔ عورتیں مجھے الگ الزام دے رہی ہیں کہ میں نے اپنے بیٹے کا گھر اجاڑا ہے۔

نادرہ کا خاوند کچھ تو پہلے ہی اکھڑا تھا۔ ماں کو سزا دینے پر آیا تو اتنا ظالم ہو گیا کہ اُس نے اپنا گھر آباد نہ کر کے ماں کو اذیت میں مبتلا کر دیا۔ آخر میں اُس نے ماں سے کہنا شروع کر دیا ـــــ "اپنے کئے کی سزا بھگتو۔ تم نے اپنی بہو کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ تمہارے دل میں اُس کا ذرا سا بھی پیار نہیں تھا۔ اس کی سزا تمہارے بیٹے کو ملی اور تمہیں ملی ہے۔"

وہ مجھے سناتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ میں اُس کی نفسیات پر بہت حیران ہوا لیکن اس کی عقل کی میں نے تعریف کی۔ ایسی ماں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیئے تھا۔

اس شخص کے ساتھ مغز کھپائی کر کے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

## پچھواڑے کے جنات

لڑکے کا کوئی ذرا سا بھی سراغ نہ ملا لیکن مجھے کچھ یقین ہونے لگا کہ لڑکے کو عداوت کی بنا پر اغوا کیا گیا ہے۔ اس قسم کے اغوا میں قتل کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے تیزی سے حرکت کرنی تھی۔ وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن گمشدہ لڑکے کے دو گہرے دوستوں کو بلایا۔ اُنہوں نے خالی تختی دکھا دی۔ وہ کہتے تھے کہ حنیف شرارتی لڑکا نہیں تھا۔ اُس نے کسی لڑکے کو کبھی نہیں چھیڑا تھا، لڑکے کو وہ کیا چھیڑے گا۔

نادرہ کے متعلق مجھے مخبروں سے رپورٹیں ملنے لگیں۔ وہ شرافت، ملنساری اور غریب پروری کی وجہ سے مشہور تھی، لیکن اکثر لوگ کہتے تھے کہ لطیف کے



ساتھ اس کے تعلقات صاف ستھرے نہیں ہو سکتے۔ نادرہ کے خاوند کے متعلق بھی مخبروں نے بہت کچھ بتایا لیکن ان تمام رپورٹوں میں گمشدہ لڑکے کا سراغ نہیں تھا۔

ایک رپورٹ یہ تھی کہ لطیف کی بیوی اُس سے ناراض اور شاکی رہتی ہے کیونکہ لطیف کا دوستانہ اور دلچسپیاں نادرہ کے ساتھ تھیں۔ میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا، اور تین چار مرتبہ لطیف کی بیوی روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ لطیف کی بیوی کے دو بھائی تھے۔ ان کی لطیف کے ساتھ تُو تُو مَیں مَیں ہوتی تھی۔

یہ بھی پتہ چلا کہ لطیف کی بیوی اور نادرہ کی بھی لڑائی ہوتی تھی۔ یہ کسی کے گھر شادی کے اجتماع میں معرکہ ہوا تھا۔ نادرہ نے لطیف کی بیوی کی بہت بے عزتی کی تھی۔ نادرہ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم تو نٹنی ہو۔ تم اتنے اچھے خاوند کے قابل کہاں تھیں۔ یہ لڑائی بڑی سخت تھی۔ دوسرے دن لطیف نے اپنی بیوی کو طلاق کی دھمکی دے دی تھی۔ اس پر لطیف کی بیوی کے بھائیوں کی لطیف کے ساتھ دُوبدو ہاتھا پائی تک ترش کلامی ہوتی تھی۔ یہ ایک ہی مہینہ پہلے کا واقعہ بتایا گیا۔

مجھے غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ گمشدہ لڑکے کے متعلق مجھے ذرا سی بھی کوئی بات نہیں بتائی جا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لڑکے کو جن بھوت اٹھا کر لے گئے ہوں۔ میں نے نادرہ کے بدمعاش بھائی نعمت علی عرف علیا بدمعاش کو تھانے لانے کے لئے آدمی بھیجے تھے لیکن اُس کا بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس سے میرا یہ شک پختہ ہو گیا کہ حنیف کو علیا بدمعاش نے غائب کیا ہے اور اغوا کرنے کی وجہ جائیداد ہے۔ بیشک حنیف اُس کا بھانجا تھا اور یہ بھی کہ نادرہ نے اپنے اس بھائی کو جائیداد میں سے حصّہ پیش کیا تھا جو اُس نے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن کسی انسان کے متعلق وثوق سے بتایا نہیں جا سکتا کہ اُس کے سینے میں کیا پوشیدہ ہے۔

ایک دن اور گزر گیا۔ نادرہ آگئی۔ میں کسی اور کیس میں مصروف تھا۔

تین چار دنوں میں اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں سُوجی ہوئی اور ان کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی چال بوڑھی عورتوں کی طرح ہو گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہُوا۔ اس نے آتے ہی پوچھا کہ کوئی سراغ ملا ہے؟ میں نے اُسے جھوٹی تسلیاں دیں۔ میں سوچنے لگا کہ اس کا بیٹا اگر قتل ہو گیا تو یہ عورت زندہ نہیں رہ سکے گی۔

"میں نے بہت منّتیں مانی ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "ایک نجومی نے بتایا ہے کہ لڑکا مل جائے گا ..... میرا بیٹا آجائے گا تو اُسے اجمیر شریف لے جا کر اُس کے ہاتھوں وہاں ریشمی چادر چڑھواؤں گی"۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے کیا کیا منّتیں مانی ہیں۔ میں سُنتا رہا اور اُسے کہا کہ بعض عامل اور پیر کالے علم کے ذریعے گمشدہ چیز یا انسان کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ کہاں ہے۔ وہ بھی کسی ایسے اُستاد کے پاس جاتے۔

"کل ہمارے محلّے کی مسجد کے مولوی صاحب خود ہی میرے گھر آ گئے تھے"۔۔۔ نادرہ نے مجھے بتایا ۔۔۔ "وہ کتاب نکال کر بتا دیتے ہیں کہ چوری کس نے کی ہے اور مال کہاں ہے۔ مجھے کہنے لگے کہ مجھے تمہارے بیٹے کی گمشدگی کی اطلاع رات کو ملی تھی۔ تمہارا ابھی ایک بیٹا ہی بیٹا ہے۔ اللہ اُسے دشمنوں سے بچائے۔ میں نے رات کو کتاب نکالی تو کچھ اور ہی معاملہ نکلا۔ اسی لئے چلا آیا ہوں ..... مولوی صاحب کی یہ بات سُن کر میں بہت ہی پریشان ہوئی۔ کچھ اور ہی معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ کر کہا کہ وہ جس قدر دولت مانگیں گے ان کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گی۔ مجھے میرا بچّہ واپس لا دیں .....

"مولوی صاحب نے کہا ۔۔۔ 'مجھے دولت کا لالچ نہیں۔ مجھے انسانی ہمدردی تمہارے پاس لے آئی ہے۔ میرے حساب میں ایک شرط نکلی ہے جو تمہیں پوری کرنی پڑے گی'۔۔۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اور روتے ہوئے اُن سے شرط پوچھی۔ مولوی صاحب نے کہا ۔۔۔ 'میری کتاب نے بتایا ہے کہ اس گھر میں کوئی غیر مرد آتا ہے۔ نامحرم کا اس گھر میں آنا تمہیں ابھی نہ جانے اور کیا



نقصان پہنچائے گا'۔۔۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے گھر میں ایک ہی نامحرم آتا ہے۔ وہ میرا مُنہ بولا بھائی ہے ..... مولوی صاحب نے کہا ۔۔۔ 'تمہارے مکان کے پچھواڑے بڑے نیک جن کا بسیرا ہے۔ اُسے اس گھر میں کسی غیر مرد کا آنا سخت بُرا لگتا ہے۔ مُنہ بولے بھائی کو بھی وہ غیر مرد سمجھتا ہے۔ اُس نے تمہارے بیٹے کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے اور مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ خیریت چاہتی ہو تو جو آدمی تمہارے گھر آتا ہے اس کے ساتھ تعلق توڑ لو۔ تمہارا بیٹا خود ہی گھر آجائے گا'۔۔۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں یہ شرط پوری کر دوں گی۔ خدا کے لئے مجھے میرا بچّہ واپس دلا دیں۔ مولوی صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ میرا بچّہ حاضر کرا دیں گے"۔

"تم نے شرط پوری کر دی ہے؟"۔۔۔ میں نے نادرہ سے پوچھا۔

"ابھی نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا اور دُور کے کسی گاؤں کا نام لے کر کہا ۔۔۔ "وہاں ایک ہندو سنیاسی ہے جو زمین کے نیچے کے راز بھی بتا دیتا ہے۔ لطیف اُس کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ آئے گا تو اُسے کہہ دوں گی کہ میرے گھر نہ آیا کرے"۔

مجھے اس عورت پر رحم آ رہا تھا۔ وہ بھٹکتی پھر رہی تھی۔ کسی نے جو کچھ کہا اُس نے مان لیا۔

## مسجد اور تھانے میں جو فرق ہے

نادرہ کے جانے کے بعد یہ مولوی میرے دماغ میں اٹک گیا۔ وہ خود نادرہ کے گھر گیا تھا اور اُسے شرط یہ بتائی کہ وہ کسی غیر مرد کو گھر میں نہ آنے دے۔ یہ غیر مرد صرف لطیف تھا۔ مولوی نے کہا تھا کہ یہ شرط پوری کر دو تو تمہارا بیٹا واپس آجائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ لطیف کی بیوی رُوٹھ کر چند مرتبہ اپنے ماں باپ کے پاس جا چکی تھی۔ اُس کے بھائیوں کا جھگڑا لطیف کے ساتھ ہُوا تھا۔

یہ ایک ڈرامہ تھا جو میرے ذہن نے کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی عقل اور اپنے تجربے کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا تو میری پولیس کی حس نے مجھے حکم دیا کہ مولوی کو تھانے بلاؤ۔ میں نے اُسی وقت ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا کہ مولوی کو ساتھ لے آئے۔ نادرہ سے کہا کہ وہ پیروں اور نجومیوں کے چکر میں نہ پڑے۔ اس کی بجائے گھر میں ختم قرآن کرائے اور خود نماز کے علاوہ نفل پڑھتی رہے۔

مولوی صاحب تھانے میں آئے تو پورے جلال میں تھے۔ ہونٹ کسی وِرد میں ہل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرمہ بھرا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے دروازے میں کھڑے ہو کر میرے دروازے کے اندر نظر دوڑائی جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ یہ کمرہ اس قابل ہے کہ نہیں کہ اس میں وہ داخل ہوں یا واپس چلے جائیں۔ میں نے اُٹھ کر اور آگے بڑھ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور میں جُھک گیا۔ پھر انہیں احترام سے بٹھایا۔

"کیوں بلایا ہے مجھے؟" ــــ اُنہوں نے جلالی لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو تکلیف دینے کا گناہ اِس لئے کیا ہے کہ سُنا ہے جِنّات آپ کو راز کی بات بتایا کرتے ہیں" ــــ میں نے غلاموں کی طرح کہا ــــ "ایک لڑکا گم ہو گیا ہے۔ کچھ سراغ نہیں مل رہا۔ کسی نے بتایا ہے کہ آپ چوری کا مال اور گمشدہ عورت اور بچے برآمد کرا دیا کرتے ہیں۔ میرے حال پر رحم کریں۔ آپ کا مسلمان بھائی ہُوں۔ میری نوکری کا سوال ہے۔"

"ہم اس عورت کو بتا چکے ہیں" ــــ مولوی نے کہا ــــ "جِنّات نے ایک شرط بتائی ہے۔ وہ پوری ہو گئی تو بچّہ واپس آجائے گا۔"

"مولانا!" ــــ میں نے فدویوں کی طرح گزارش کی ــــ "مجھے یہ بتائیں کہ بچہ اس وقت کہاں ہے اور وہ کہاں سے واپس آئے گا۔"

"ہم یہ نہیں بتا سکتے" ــــ مولوی نے مجھے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہوئے نظریں دوسری طرف پھیر کر کہا ــــ "اُسے کہو شرط مان لے۔ لڑکا مل جائے گا۔"

"جناب مولانا!" ــــ میں نے گزارش کی ــــ "مجھے صرف یہ بتا دیں



کہ آپ کو اس کام کی کتنی اُجرت ملی ہے، پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کو یہ اُجرت کس نے دی ہے اور کیوں دی ہے۔"

اُس نے چونکنے کی بجائے آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک جلالی چمک تھی۔ آدمی اُستاد معلوم ہوتا تھا۔

"تم تھانیداری کے رُعب میں فضول باتیں کر رہے ہو۔"

"ہاں جناب مولانا!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں آپ کو یہی احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں تھانیدار ہوں اور آپ اس وقت تھانے میں ہیں مسجد میں نہیں۔"

"ہمارے لئے مسجد اور تھانے میں کوئی فرق نہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "ہم جو بات مسجد میں کہیں گے وہی بات تھانے میں کہیں گے" ــــ اُس نے انگلی آسمان کی طرف اُٹھا کر کہا ــــ "ہمارا تھانیدار وہ ہے۔"

"مولانا آپ جو جھوٹ مسجد میں بول سکتے ہیں وہ تھانے میں نہیں چل سکتا" ــــ میں نے کہا ــــ "آپ نے جس تھانیدار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ آپ کو اگلے جہان میں پکڑے گا اور میں اُس کے حکم سے آپ کو اسی جہان میں پکڑوں گا .... کیا آپ کو اپنی عزّت عزیز نہیں؟"

اب اُس کے چہرے پر جلال کی بجائے اُس کا اپنا رنگ آگیا۔

"میری بات غور سے سُنیں مولوی صاحب!" ــــ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ــــ "ہم ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ میں انہیں تماشا نہیں دکھانا چاہتا۔ ذرا اپنے مذہب کا خیال کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی سیاست میں آپ نہ آئیں۔ مسجد اور گھر میں بیٹھ کر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن بات جب تھانے میں آجاتی ہے تو پھر آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں آپ گڑبڑ کریں گے تو یہ جُرم ہو گا۔ نادرہ کے گھر کوئی غیر محرم جاتا ہے تو جاتا رہے۔ آپ مذہبی پیشوا کی حیثیت سے اُسے مسجد میں بلا کر شرمسار کریں۔ چکّر نہ چلائیں لیکن آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ ان بڑی ذات والوں کے مُنہ پر کوئی بات کہہ سکیں۔"

"بہت اچھا جناب!" — اُس نے برخوردارانہ لہجے میں کہا "میں نے آپ کی بات سمجھ لی ہے۔ اب میں جاؤں؟"

"کیا جلدی ہے مولوی صاحب!" — میں نے کہا — "ظہر کی نماز میں ابھی چار گھنٹے باقی ہیں .... میں نے آپ کو اس لئے نہیں بلایا کہ آپ میری بات سمجھ جائیں اور چلے جائیں۔ میری اب یہ خواہش ہے کہ آپ کے دل میں جو بات ہے وہ آپ مجھے سمجھا کر جائیں۔ مجھے بتائیں کہ لڑکا کہاں ہے .... اور میں آپ کو ایک بار پھر خبردار کرتا ہوں کہ یہاں چکر بازی نہیں چلے گی۔ میں آپ کو تیسری بار نہیں کہوں گا۔ زیادہ انتظار بھی نہیں کروں گا۔ حوالات میں بند کر دوں گا۔"

اُس نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہا — "اپنے پیش امام کو حوالات میں بند کرتے آپ کو کچھ خیال نہیں آئے گا؟"

"مجھے بہت خیال آئے گا" — میں نے کہا — "مجھے بہت افسوس ہوگا۔ افسوس یہ نہیں ہوگا کہ میں نے پیش امام کو حوالات میں بند کر دیا ہے بلکہ یہ دُکھ ہوگا کہ میرا پیش امام جھوٹا ہے۔"

"آپ مجھ پر کیا شک کر رہے ہیں؟"

"مولوی صاحب!" — میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "آپ سمجھ گئے ہیں کہ میں آپ پر کیا شک کر رہا ہوں۔ آپ بول پڑیں۔ ذرا سے انعام کے لالچ میں اتنی عزت اور اپنے بیوی بچوں کو تباہ نہ کریں۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔

"مولوی صاحب!" — میں نے کہا — "آپ جتنی جلدی زبان کھولیں گے آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔"

## مولوی نے آخر سچ بولا

میں مولوی کو جال میں تولا ہی رہا تھا لیکن یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں



جس شک پر کام کر رہا ہوں یہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کچھ سوچ تو لیا تھا لیکن میری سوچ اُلٹی بھی ہو سکتی تھی۔ کسی مولوی یا کسی پیر کو تھانے بلانا اور مشتبہ بٹھانا بڑے خطرے والی حرکت ہوتی تھی۔ لوگ ان پر جانیں قربان کرتے تھے۔ ان پیروں اور مولویوں نے لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کیا ہوا ہوتا تھا۔ آج کل بھی دیہات میں مسجدوں کے پیش امام اور پیر دیہاتیوں کی سیاست بازیوں میں تعویذوں اور پیشین گوئیوں کے ذریعے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آج کل بھی بعض پیش امام "کتاب نکالتے" اور غیب کا حال احوال بتاتے ہیں۔ ان میں سے بعض جرائم میں اعانت کا ارتکاب بھی کر گزرتے ہیں۔

یہ مولوی اسی نسل کا معلوم ہوتا تھا۔ میں اُس کے انداز اور رویّے سے سمجھ گیا کہ جرم میں اس کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ہے۔ اسے کچھ سمجھایا، کچھ ڈرایا اور اُس نے اپنا سینہ کھول دیا۔

"میں یہ نہیں بتا سکتا کہ لڑکا کہاں ہے" — اُس نے کہا — "یہ بتا سکتا ہوں کہ اُسے کس نے غائب کرایا ہے .... وہ شخص چوہدری لطیف کی بیوی کا بڑا بھائی چوہدری سلامت ہے۔ اُس کا چھوٹا بھائی چوہدری کرامت بھی اُس کے ساتھ ہے۔"

"کیا لڑکے کو قتل کیا جائے گا؟"

"نہیں" — مولوی نے جواب دیا — "اگر نادرہ نے اُن کی شرط پوری کر دی تو لڑکے کو شہر میں لا کر چھوڑ دیا جائے گا اور وہ اپنے گھر چلا جائے گا۔"

مولوی نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور منت سماجت کی کہ چوہدریوں کو پتہ نہ چلے کہ مولوی نے بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ اس قسم کا ہر گواہ تھانیدار سے یہ منت ضرور کیا کرتا ہے اور ہر تھانیدار "پکا" وعدہ کیا کرتا ہے کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دے گا مگر ضرورت پڑے تو تھانیدار اُسے حوالات میں بند بھی کر دیا کرتا ہے۔ میں نے بھی مولوی سے کہا کہ وہ بے غم ہو کے ساری بات بتائے۔

اُس نے بتایا کہ اُسے معلوم تھا کہ لطیف نادرہ کے سارے کام کرتا اور اُس کے گھر جاتا ہے اور مولوی کو یقین تھا کہ ان کے تعلقات پاک ہو ہی نہیں سکتے لیکن مولوی نے لطیف پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اُس پر شک کرتا ہے۔ مولوی کو دوسروں سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ لطیف کے گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے اور اُس کا اپنی بیوی کے بھائیوں سلامت اور کرامت کے ساتھ جھگڑا ہو چکا ہے۔ اگر یہ حرکتیں کسی چھوٹی ذات کے گھرانے میں یا کسی غریب کسان یا کسی مزارعے کے گھر میں ہو رہی ہوتیں تو چوہدری انہیں گھر بلا کر لعن طعن کرتے لیکن یہ ڈرامہ چوہدریوں کے گھروں میں کھیلا جا رہا تھا اس لئے انہیں کوئی روک ٹوک نہیں سکتا تھا۔

ایک روز چوہدری سلامت مولوی سے ملا اور اُسے کہا کہ وہ ایک کام کرانا چاہتا ہے لیکن کسی کو پتہ نہ چلے۔ مولوی کو معلوم تھا کہ چوہدریوں کا کام کرنے کا انعام کتنا زیادہ ہوتا ہے۔ اُس نے سلامت سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا کام پوشیدہ رکھے گا۔ سلامت نے کام یہ بتایا کہ ایک لڑکا لاپتہ ہو جائے گا اور مولوی لڑکے کی ماں کو بتائے گا کہ لڑکے کو ایک جن نے غائب کیا ہے۔ اگر ماں ایک شرط مان لے تو جن لڑکا واپس کر دے گا۔

مولوی کچھ گھبرایا۔ اُس نے کہا کہ وہ کام کر دے گا لیکن اس میں قتل اور خون خرابہ نہیں ہونا چاہئے اور لڑکے کی ماں سے ایسی شرط نہ منوائی جائے جو بہت بڑا جرم ہو۔ دراصل مولوی ڈر گیا تھا کہ یہ کوئی خطرناک واردات ہوئی تو وہ بھی رگڑا جائے گا۔ چوہدری سلامت نے اُسے بتایا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ لڑکا صحیح سلامت رہے گا اور اُس کی ماں سے ایک جائز شرط منوائی جائے گی۔ مولوی نے وعدہ کیا کہ اُسے کام بتایا جائے، وہ کر دے گا۔ سلامت نے اُسے کہا کہ روپوں سے وہ اُس کی جیب بھر دے گا اور کپڑوں کے دو جوڑے دے گا۔

سلامت رات کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔



# مولوی جو ملزم بن گیا

عشاء کی نماز کے بعد دونوں بھائی، سلامت اور کرامت مولوی کے پاس گئے اور اُسے کام یہ بتایا کہ نادرہ کا بیٹا دو تین دنوں میں لاپتہ ہو جائے گا۔ دو روز بعد مولوی نادرہ کے گھر جائے گا اور اُسے بتائے گا کہ اُس کے گھر میں ایک جن کا بسیرا ہے اور اس جن کو پسند نہیں کہ کوئی نامحرم اس گھر میں آئے۔ اگر نادرہ اپنی اور اپنے بیٹے کی خیریت چاہتی ہے تو کسی غیر مرد کو گھر نہ آنے دے نہ باہر اس کے ساتھ تعلق رکھے۔ ان کا اشارہ لطیف کی طرف تھا۔ انہوں نے مولوی سے کہا کہ وہ نادرہ کو لڑکا واپس ملنے کی یہ شرط بتائے کہ وہ لطیف کے ساتھ تعلق توڑ لے۔

تینوں نے سوچ بچار اور بحث مباحثہ کر کے سکیم تیار کر لی۔ اغوا میں مولوی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ بہرحال وہ اعانتِ جُرم کا مجرم تھا۔ سلامت اور کرامت نے بے بہا انعام کا وعدہ کیا اور یہ دھمکی بھی دی کہ مولوی نے دھوکہ دیا یا وہ کام نہ کر سکا یا اُس نے راز فاش کر دیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

سکیم بڑی اچھی تھی۔ جنوں اور بھوت پریت کو آج بھی لوگ مانتے ہیں۔ وہ زمانہ تو تھا ہی پسماندگی کا۔ سکیم کی کامیابی یقینی تھی۔ مولوی کو سلامت اور کرامت نے پچیس روپے پیشگی دیئے۔ آج کے حساب سے یہ رقم کم و بیش تین سو روپے بنتی ہے۔ باقی انعام کام کر دینے کے بعد دیا جانا تھا۔

"ہم لوگ مجبور ہیں ملک صاحب!" ـــــ مولوی نے بے بسی کے لہجے میں کہا ـــــ "انعام کا لالچ تو ہوتا ہی ہے۔ زیادہ ڈر یہ ہوتا ہے کہ ہم ان لوگوں کی مرضی کے مطابق نہ چلیں تو کھائیں کہاں سے اور رہیں کہاں۔ میں ان کی مرضی کے مطابق تیار ہو گیا.... چوتھے روز چوہدری سلامت میرے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ میں نادرہ کے گھر جاؤں اور اُسے وہ بات کہوں

"....مجھے پتہ چل چکا تھا کہ نادرہ کا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے۔"

مولوی نادرہ کے گھر ہمدرد بن کر گیا اور اُسے وہی بات کہی جو نادرہ مجھے بتا گئی تھی۔ نادرہ پر اُس کا وہی اثر ہوا جو یہ لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن لطیف گاؤں میں نہیں تھا۔ نادرہ اُس کے ساتھ تعلقات توڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ان لوگوں نے لطیف اور نادرہ کا تعلق توڑنے کا بڑا اچھا طریقہ اختیار کیا تھا۔

میں نے مولوی سے کہا کہ اُسے یہ بیان مجسٹریٹ کے سامنے دینا پڑے گا۔ وہ گھبرا گیا۔ میں نے اُسے غلط تسلی دی کہ مجسٹریٹ کو بیان دینے سے وہ محفوظ ہو جائے گا ورنہ اُسے حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ مولوی نے اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر پھینک دیا تھا اور وہ ندی میں تنکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ مجسٹریٹ کو بیان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے اُسے ابھی حوالات میں بند نہ کیا۔ تھانے میں بٹھائے رکھا۔ وہ اب ملزم تھا۔

اے۔ایس۔آئی سے کہا کہ وہ چوہدری سلامت اور اُس کے چھوٹے بھائی کرامت کو گرفتار کر کے لے آئے۔

تھوڑی دیر بعد تھانے کے احاطے کے باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ یہ معمولی کیس نہیں تھا۔ چوہدریوں کا بیٹا لاپتہ ہو گیا تو چوہدری ہی پکڑے گئے۔ لوگوں کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ ایک محلے کی مسجد کا پیش امام بھی تھانے بلایا گیا ہے۔

چوہدری سلامت اور کرامت تھانے میں لائے گئے تو میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ تمہارے مولوی صاحب تم سے پہلے تھانے میں آ گئے تھے۔ تم دونوں حوالات میں بیٹھو....وہ آخر چوہدری تھے اور دلیر بھی تھے۔ دونوں نے مجھ پر غصہ جھاڑنے کی کوشش کی کہ میں ان کی بے عزتی کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں کہا کہ میں انہیں پوری عزت سے رکھوں گا۔ حوالات میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اچھی



طرح سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں۔ مان جاؤ گے تو سُکھی رہو گے۔ نہیں مانو گے تو تمہارا ہی نقصان ہے۔ مولوی میرے پاس ہے اور لڑکا بھی سمجھو کہ میرے پاس ہے۔

دونوں چوہدریوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر چوہدری سلامت نے مجھے آہستہ سے کہا —"ہماری ایک بات سُنیں گے؟"— چھوٹا بھائی بولا —"جو خدمت کہیں گے کریں گے"— بڑے بھائی نے کہا —"جتنی آپ چاہیں گے۔ ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں"

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر میں اشارہ کرتا تو وہ میرے جسم کے وزن جتنے روپے میرے آگے ڈھیر کر دیتے لیکن میں نے اشارہ اے۔ایس۔آئی کو کیا اور اُس نے دونوں کو حوالات میں بند کر دیا۔

## بہن کے دو بھائی

اب مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں بھائیوں سے لڑکا برآمد کرانا تھا میرا طریقہ یہ تھا کہ میں آدھی رات کے بعد پوچھ گچھ شروع کیا کرتا تھا مگر ان دونوں سے فوراً معلوم کرنا تھا کیونکہ ایک خطرہ تھا۔ انہوں نے لڑکا شاید کسی اور سے اغوا کرایا ہو گا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ ان کی سکیم یہ تھی کہ نادرہ لطیف سے تعلق توڑ لے تا کہ ان کی بہن کی ازدواجی زندگی اچھی ہو جاتے تو لڑکے کو وہ آزاد کر دیں گے۔ اب انہیں میں نے گرفتار کر لیا تھا معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھی کون تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ اس صورتِ حال میں گرفتاری سے بچنے کے لئے لڑکے کو قتل کر کے لاش غائب کر دیں گے۔ انسانی ہمدردی کی خاطر میرا فرض یہ تھا کہ لڑکا زندہ برآمد کروں۔

میں نے بڑے بھائی چوہدری سلامت کو حوالات سے نکلوا کر اپنے دفتر میں بٹھایا اور دوستانہ بے تکلفی اور رازداری سے کہا کہ چوہدری!

مجھے تمہاری خاندانی عزت کا خیال آتا ہے۔ بتاؤ کیا دیتے ہو۔ میں اندر ہی اندر معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کروں گا۔

"ہزاروں کے حساب سے دیں گے" — اُس نے کہا — "ہمیں جانے دو۔"

"میں ہزاروں کے حساب سے ہی لوں گا لیکن مجھے لڑکا چاہیئے" — میں نے کہا — "میرے پاس لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہو چکی ہے۔"

"آپ ہمیں چھوڑیں ہم لڑکے کو چھوڑ دیں گے۔"

وہ بڑا ہی اکھڑ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے وہ تھانیدار سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔

"مجھے پہلے لڑکا چاہیئے" — میں نے کہا — "رات کو سہی۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ رات کے اندھیرے میں لڑکا میرے پاس آجاتے اور تم اپنے بال بچوں کے پاس چلے جانا۔ لین دین اُسی وقت ہو جاتے گا۔"

"لین دین اُس وقت ہو گا جب ہم اپنے گھر چلے جائیں گے" — اُس نے کہا — "ہم دونوں بھائی کوئی بیان نہیں دیں گے۔ لڑکا بھی ہم نہیں دیں گے۔ وہ خود گھر پہنچ جاتے گا۔ آپ مُنہ سے بولیں کیا لیں گے۔"

"چوہدری!" — میں نے اُسے کہا — "میرے ساتھ ضد نہ کرو۔ میں تمہیں سزا سے بچا رہا ہوں۔ خدا کی قسم رگڑے جاؤ گے۔ لڑکا تو میں برآمد کر ہی لوں گا لیکن سن لو چوہدری! لڑکے کے جسم پر ذرا سی خراش بھی ہوتی تو دونوں بھائیوں کو عمر قید دلا دوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے نادرہ اپنا جادو یہاں بھی چلا گئی ہے" — سلامت نے مسکراتے ہوتے طنزیہ کہا — "سونے چاندی میں نہلا دوں گا ملک صاحب! اتنی دولت آپ نے کہاں دیکھی ہو گی۔"

مجھے احساس ہو گیا کہ یہ شخص بہت دلیر اور پکا ہے۔ ویسے نہیں مانے گا۔ پولیس کے پاس کچھ طریقے اور بھی ہوتے ہیں۔ میں نے چوہدری سلامت کو ایک کانسٹیبل کی حراست میں تھانے کے پیچھے بھیج دیا اور اُس کے چھوٹے بھائی کرامت کو دفتر میں بلایا۔ وہ بڑے بھائی سے زیادہ پکا اور ڈھیٹ نکلا۔



میں نے اُسے کہا تھا کہ اُس کے بڑے بھائی نے ساری بات سنا دی ہے، کچھ باتیں تم سے پوچھنی ہیں۔

"آپ ساری باتیں اُسی سے پوچھیں" — اُس نے کہا۔

"میں نے اُس کے ساتھ وہ بات طے کر لی ہے" — میں نے کہا — "سمجھو کہ سودا ہو گیا ہے۔ لڑکا تمہارا بھائی لائے گا اور تم دونوں گھر چلے جاؤ گے۔"

"کون سا لڑکا؟"

اُس نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے باتوں میں اُسے اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کی۔ دوستانہ طریقہ بھی اختیار کیا لیکن وہ پتھر بنا رہا۔

"تھانیدار صاحب!" — اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا — "اُس مولوی کے تو سمجھو بچے یتیم ہو گتے۔ یہ اسی تھانے میں یا کچہری میں قتل ہو جائے گا۔ یہ بھی سُن لو کہ لڑکا ہم نے غائب کیا ہے۔ ماں کو زندہ مل جاتے گا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ چوہدری لطیف کے ساتھ تعلق توڑ لے۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنا میرے لئے بہتر تھا۔ میں نے کرامت کو ہتھکڑیاں لگوا کر کانسٹیبلوں کی بارک میں بٹھا دیا اور سلامت کو حوالات میں بند کرا دیا۔ میں ان دونوں کو اکٹھا رکھنے میں نقصان سمجھ رہا تھا۔ یہ تو ان سے معلوم کرنا ہی تھا کہ لڑکا کہاں ہے۔ میرے پاس اس کا طریقہ موجود تھا جو ان کے لئے اچھا نہیں تھا۔ میں یہ طریقہ استعمال کرنے سے گریز کیا کرتا تھا لیکن یہ دونوں اغوا کے مجرم تھے مشتبہ نہیں تھے۔ انہیں اُس طریقے کی چکی میں پیسنے کا مجھے افسوس نہیں تھا۔

## خون کے رشتے

اُس شام خدا نے میری مدد کی۔ ایسا واقعہ ہو گیا جسے محض اتفاق کہا کرتے ہیں۔ خدا نے ماں کی فریادیں سُن لیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں

نے اے۔ایس۔آئی سے کہہ دیا تھا کہ سلامت اور کرامت کو نہ کھانے کے لئے کچھ دینا نہ پینے کے لئے پانی دینا اور جب یہ دونوں گہری نیند سو جائیں انہیں "اُس" کمرے میں لے جانا۔ میں اپنے گھر جانے لگا تھا۔

تھانے کے احاطے میں دو گھوڑے داخل ہوئے۔ اندھیرا ابھی زیادہ گہرا نہیں ہُوا تھا۔ ایک گھوڑے پر دو سوار تھے۔ میں جاتے جاتے رُک گیا۔ وہ قریب آئے تو دیکھا کہ دونوں سوار زخمی تھے۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔ ان کے ساتھ چودہ پندرہ سال کی عمر کا ایک خوبصورت لڑکا تھا۔ وہ تینوں گھوڑوں سے اُتر کر آگے آئے تو ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ نادرہ کا خاوند تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ ہے اُس کا گمشدہ بیٹا حنیف اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا وہ نادرہ کا بھائی نعمت علی عرف علیا بدمعاش تھا ــــ میری تفتیش ختم ہوگئی۔

نادرہ کے خاوند نے تقریباً چار میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا ــــ "اغوا کا ایک مجرم وہاں زخمی پڑا ہے۔ اُسے ہم وہاں کے نمبردار کے حوالے کر آئے ہیں۔ اس لڑکے کو ہم نے اُس کے ساتھیوں سے چھینا ہے۔ اُسے وہاں جا کر پکڑیں"۔

اس سے اور علیا بدمعاش سے مختصر سی بات سُن کر میں نے اے۔ایس۔آئی سے کہا کہ چار کانسٹیبل ساتھ لے جائے اور اس آدمی کو گرفتار کر کے لے آئے۔ میرا اپنا یہ حال ہُوا جا رہا تھا جیسے مجھے چکر آ رہے ہوں۔ میرے لئے اس ڈرامے کا یہ منظر غیر متوقع تھا بلکہ معجزہ تھا۔ میں نے ان تینوں کو اپنے دفتر میں بٹھایا تو سب سے پہلے نادرہ کے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔ اُس کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ روتا رہا ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ نادرہ کو بلا لائے۔

"اُس کے آنے تک مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لیں" ــــ نادرہ کے خاوند نے کہا ــــ "میں اُس کے سامنے نہیں بیٹھوں گا۔ مجھے اور نعمتے (علیا) کو ہسپتال بھیج دیں تو اچھا ہے۔ دیہاتیوں نے ہمارے زخموں پر فضول



سی پٹیاں باندھی تھیں۔ ڈاکٹر زخم دیکھ کر پٹی کر دے تو اچھا ہے"۔

"دماغ کو ٹھکانے رکھو یار!" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "تمہیں اب معلوم نہیں کتنی بار نادرہ کے سامنے بیٹھنا پڑے گا۔ یہاں بیان دینے ہوں گے۔ عدالت میں گواہی دینی ہوگی .... چلو ہسپتال چلتے ہیں۔ وہیں سُنوں گا کہ یہ قصّہ کیا ہے"۔

"ذرا ٹھہر جائیں" ــــ نعمت نے کہا ــــ "نادرہ کو آپ نے بلایا ہے۔ اُسے آنے دو۔ بچہ بھی ماں سے ملنے کو بیتاب ہوگا"۔

چودہ پندرہ سال کی عمر کا لڑکا بچہ بن گیا اور رو کر بولا ــــ "مجھے امی کے پاس جانے دو"۔

اُس کا باپ تو چُپ رہا۔ نعمت نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اُس کا سر چُوما اور اُسے کہا کہ امی آ رہی ہے۔

اُس کی امی اس طرح آئی جیسے اُڑ کر آئی ہو۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ اُس نے نادرہ کے دروازے پر دستک دی تو نادرہ باہر آئی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے کہا کہ تمہارا بیٹا تھانے میں آگیا ہے۔ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو دھکا دیا اور دروازہ کھُلا چھوڑ کر بہت تیز دَوڑ پڑی۔ ہیڈ کانسٹیبل ابھی وہیں کھڑا تھا۔ نادرہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ تھانے میں بھی دوڑتی ہوئی داخل ہوئی۔ میرے کمرے میں وہ طوفان کی طرح آئی اور رُک کر اُس نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ پھر چیل کی طرح جھپٹ کر اُس نے اپنے بیٹے کو دبوچ لیا۔

اُس نے اپنے بیٹے کو یوں پاگلوں کی طرح رہ رہ کر چُوما جیسے اُسے چاٹ لینا چاہتی ہو۔ کچھ دیر بعد اُس نے بچے کو چھوڑ کر پہلے مجھے پھر اپنے خاوند کو پھر اپنے بھائی نعمت کو دیکھا جیسے اُسے اب پتہ چلا ہو کہ اس کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ اُن دونوں کے کپڑے خون سے لال دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اُس نے پھر میری طرف دیکھا۔

نعمت

"یہ دونوں تمہارے بچے کو خود زخمی ہو کر لاتے ہیں" — میں نے کہا۔

اب اُس نے اپنے خاوند اور بھائی کو دیکھا تو اُس کے چہرے کا تاثر کچھ اور تھا۔ اُس کے خاوند نے سر جُھکا لیا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو بہن!" — نعمت نے کہا — "یہ معجزہ ہُوا ہے۔"

نادرہ نے میری طرف دیکھا اور بولی — "یہ ان دونوں کا اپنا خون ہے۔ خون کے رشتے کہاں ٹوٹتے ہیں۔"

# جذبات ایک باپ کے

حنیف کو میں ابھی گھر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ نادرہ کے خاوند اور اُس کے بھائی کو میں ہسپتال مرہم پٹی کے لیے لے گیا۔ نادرہ اور اُس کا بیٹا بھی ساتھ گئے۔ دونوں زخمیوں نے جو بیان دیتے ان سے یہ واقعہ اس طرح بنا کہ نعمت علی عرف علیا بدمعاش بہت دنوں سے پانچ میل دُور کے ایک گاؤں میں اپنے جیسے دو بدمعاشوں کے ساتھ ٹھہرا ہُوا تھا۔ وہ قصبے کی طرف پیدل آ رہا تھا۔ وہ پیدل چلنے اور گھوڑ سواری کا زمانہ تھا۔

وہ قصبے سے دو اڑھائی میل دُور رہ گیا تھا تو اسے کسی کی باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نعمت کو کسی سے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مفرور ملزم یا قیدی نہیں تھا۔ وہاں علاقہ کھڈوں والا تھا اور اُونچی اُونچی جھاڑیاں تھیں۔ نعمت جھاڑیوں کے ایک طرف جا رہا تھا۔ دوسری طرف پگڈنڈی تھی جو نشیب میں تھی۔ نعمت ان کے سامنے ہو جاتا تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ اُ[illegible] جھاڑیوں میں سے اُسے چار آدمی جاتے نظر آئے۔ اسے وہ [illegible] پہچانے لگے۔ ایک چہرہ اس کے [illegible] بانجے حنیف کا



تھا۔ اسے اُس نے چند مہینے پہلے نادرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ دوسرا چہرہ اُس کے قصبے کے رہنے والے ایک آدمی کا تھا جو غنڈوں بدمعاشوں میں اُٹھتا بیٹھتا تھا اور وہ چوہدریوں کا ہر اُلٹا سیدھا کام کر دیتا تھا۔

نعمت کو معلوم نہیں تھا کہ حنیف اغوا ہو گیا ہے۔ اُسے بڑا غصہ آیا کہ یہ لڑکا ان لوگوں کے ساتھ کیوں جا رہا ہے۔ وہ جس راستے پر جا رہے تھے وہ پیچھے ہی پیچھے جا رہا تھا۔ نعمت دبے پاؤں جھاڑیوں کی باڑ کی اوٹ میں ان تک پہنچا۔ اس نے جھاڑیوں میں سے دیکھا کہ لڑکے نے رونا شروع کر دیا تھا اور ایک آدمی نے چاقو کھول کر اس کے پہلو میں نوک رکھ کر کہا — "ہم نے کہا نہیں کہ تجھے گھر چھوڑ آئیں گے۔ چُپ ہو کے چلا چل" — قصبے کے رہنے والے آدمی نے کہا — "چُپ نہیں ہوتا تو اس کی گردن پر چاقو پھیر دو" — ایک اور نے کہا — "معلوم ہوتا ہے یہی کرنا پڑے گا۔ خواہ مخواہ ایک مصیبت سر لے لی ہے۔"

نعمت اکیلا تھا۔ اُس کے پاس بڑے سائز کا چاقو تھا لیکن وہ اکیلا تین آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے ایک آدمی کو تو پہچان لیا تھا۔ اُسے وہ پکڑوا سکتا تھا۔ اس نے وہ راستہ بھی دیکھ لیا تھا جدھر وہ لوگ جا رہے تھے۔ اُس نے فاصلے کا اندازہ کیا۔ اسے قصبہ قریب نظر آیا۔ دو اڑھائی میل کا فاصلہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ تھانے تک پہنچے۔ وہ پیدل تھا۔ دوڑ پڑا۔ وہ راستے سے ہٹ کر راستہ چھوٹا کرنے کے لیے کھڈوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتا جا رہا تھا۔

تقریباً ایک میل فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اسے تھوڑی دور ایک گھوڑ سوار جاتا نظر آیا۔ نعمت اُس کی طرف اس ارادے سے چل پڑا کہ اُسے کہے گا کہ وہ اُسے گھوڑا دے دے تاکہ وہ فوراً تھانے پہنچ جائے۔ اُس نے سوار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب گیا تو وہ سوار اُس کا بہنوئی تھا۔ اُس کے ساتھ نعمت کی کوئی زیادہ بات چیت کبھی نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان میں ناراضگی پائی جاتی تھی کیونکہ اس شخص نے اس کی بہن کو اپنے گھر بسایا نہیں تھا۔ نعمت

اُسے دیکھ کر جھجک گیا۔

"کیا بات ہے نعمتے!"— نادرہ کے خاوند نے اُس سے پوچھا — "تمہاری سانس کیوں پھولی ہُوئی ہے؟ کوئی گڑبڑ کر کے آرہے ہو؟"

نعمت نے اُسے بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے۔ نادرہ کے خاوند نے ہڑبڑا کر پوچھا — "کہاں؟ کدھر؟ میرے پیچھے سوار ہو جاؤ۔"

نادرہ کے خاوند کے پاس شاہ بلوط کی لکڑی کا بڑا خوبصورت ڈنڈا تھا جس کے دونوں سروں پر پیتل کی چمکتی ہُوئی شامیں چڑھی ہُوئی تھیں۔ یہ لکڑی مضبوط بھی ہوتی ہے اور وزنی بھی۔ نعمت نے اُسے بتایا کہ اُن تین آدمیوں میں سے ایک کے پاس لاٹھی اور ایک کے پاس کلہاڑی ہے۔ نادرہ کے خاوند نے اُسے کہا کہ فکر نہ کرو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔ تمہارا بھانجا اغوا ہو گیا ہے۔

یہاں میں آپ کو ایک اور جذباتی بات بتاؤں۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ باپ بیٹے کی آپس میں کبھی بات نہیں ہوتی تھی لیکن باپ اب آٹھ میل دُور ایک پیر کے پاس جا رہا تھا۔ اس کی کرامات بہت مشہور تھیں۔ کہتے تھے کہ کوئی عورت، آدمی یا بچہ لاپتہ ہو جاتے تو یہ پیر بتا دیتا ہے کہ کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ میں نے بھی اس پیر کی بہت سی باتیں سُنی تھیں۔ باپ اپنے جذبات کا مارا اپنے بیٹے کے متعلق پوچھنے جا رہا تھا کہ کہاں ہے لیکن اللہ کی ذات نے اُسے راستے میں ہی بیٹے کا سراغ دے دیا۔

## اغوا کی کہانی

اُنہوں نے گھوڑا دوڑایا۔ لڑکے کو ساتھ لے جانے والے جس راستے پر جا رہے تھے وہ کوئی ایک میل آگے جا کر ایک برساتی نالے میں اُتر گیا تھا۔ وہ اس خشک نالے میں سے گزر کر اُوپر گئے تو انہیں وہ لوگ نظر آ گئے۔ وہ خاصے دُور تھے۔ نادرہ کے خاوند نے گھوڑا ان کے پیچھے نہ



ڈالا بلکہ ایک طرف لے گیا تاکہ انہیں شک نہ ہو۔ بہت آگے جا کر اُس نے گھوڑا موڑا۔ اب فاصلہ تھوڑا رہ گیا تھا۔ قریب جا کر دونوں گھوڑے سے کُود کر اُترے۔ نعمت نے چاقو نکال لیا۔ اُس نے اُن آدمیوں کو للکار کر کہا کہ لڑکے کو چھوڑ دو۔

وہ مقابلے پر اُتر آئے۔ نادرہ کے خاوند اور نعمت نے اپنے قصبے کے آدمی کو پہچان لیا۔ وہ تین تھے۔ ایک کے پاس لاٹھی، دوسرے کے پاس کلہاڑی اور تیسرے کے پاس چاقو تھا۔ نادرہ کے خاوند اور نعمت نے بڑی دلیری سے وار کئے اور روکے۔ حنیف نے اس لڑائی میں اس طرح حصّہ لیا کہ ایک وزنی پتھر اٹھا کر اُس نے اپنے قصبے کے آدمی کے سر پر پیچھے سے مارا۔ اس سے پہلے اُسے نادرہ کے خاوند کے دو ڈنڈے پڑ چکے تھے۔ وہ تیورا کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔

چاقو اور ڈنڈے سے لاٹھی اور کلہاڑی کا مقابلہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ نادرہ کے خاوند اور نعمت کو کلہاڑی کے زخم آئے لیکن گہرے نہیں تھے۔ لڑکے کو ساتھ لے جانے والے مجرم تھے اس لئے انہیں بھاگنا بھی تھا۔ قریب ایک گاؤں تھا۔ اس کے کچھ آدمی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے لڑائی دیکھی تو دوڑے آئے۔ دو مجرم بھاگ گئے۔ ایک بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑا رہا۔

گاؤں والوں کو بتایا گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ گاؤں والے انہیں اور زخمی کو گاؤں میں لے گئے۔ نادرہ کے خاوند نے گاؤں کے نمبردار سے کہا کہ وہ زخمی کو اپنی حراست میں رکھے کیونکہ پولیس اس لڑکے کو تلاش کر رہی ہے اور اس لڑکے کو اس آدمی نے اغوا کیا تھا۔ نمبردار نے نادرہ کے خاوند اور نعمت کے زخموں پر دیسی دوائیاں ڈال کر پٹیاں باندھ دیں اور انہیں ایک گھوڑی بھی دی۔ اس طرح یہ دونوں حنیف کو ساتھ لے کر تھانے تک پہنچے۔

ہسپتال میں ان کی مرہم پٹی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے زخموں کی تفصیلات لکھ لیں کیونکہ اُسے گواہی دینی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مرہم پٹی کرا کے باہر نکلے

تو نادرہ نے اپنے خاوند کے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ــــ "زخم زیادہ گہرے تو نہیں؟"ــــ اور اس کے ساتھ ہی اُس کے آنسو بہنے لگے۔ بیوی نے سترہ سال بعد اپنے خاوند کے ساتھ بات کی تھی۔

حنیف نے اپنے اغوا کی کہانی یوں سنائی کہ سکول سے چھٹی کا دن تھا۔ وہ گھر سے کھیلنے کے لئے نکلا۔ اُسے اپنا کوئی دوست نظر نہ آیا۔ وہ گلی میں اُس جگہ جا کھڑا ہُوا جہاں وہ گلی ملتی تھی جو کھیتوں کو چلی جاتی تھی۔ چوہدری سلامت اس گلی میں آتا دکھائی دیا۔ وہ اس آدمی کے گھر کے سامنے رُک گیا جو اب گاؤں میں زخمی پڑا تھا۔ اُس کا نام قادر تھا۔ چوہدری سلامت قادر کے گھر میں چلا گیا اور فوراً باہر آگیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے حنیف کو سر کے اشارے سے بُلایا۔

حنیف اس کے پاس چلا گیا۔ چوہدری سلامت نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا کہ وہ یہاں کیوں کھڑا ہے۔ حنیف نے کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے انتظار میں کھڑا ہے۔ چوہدری سلامت نے اُسے کہا کہ تماشہ دیکھنا ہے تو قادر کے گھر میں چلے جاؤ۔ ایک سپیرا آیا ہُوا ہے اور اُس نے کئی رنگوں کے سانپ نکال رکھے ہیں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔ ایسے سانپ تم نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔

حنیف اندر چلا گیا۔ اُسے اتنا ہی پتہ چلا کہ پیچھے سے کسی نے اُس کی ناک پر کپڑا رکھا ہے۔ اُسے بدبو سی آئی پھر اسے ہوش نہ رہی۔ وہ ہوش میں آیا تو وہ کسی گاؤں کے کچے سے مکان میں تھا۔ دو آدمی اس کمرے میں موجود تھے۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حنیف نے رونا شروع کر دیا۔ ان دونوں آدمیوں نے اسے کہا کہ وہ خاموشی سے لیٹا رہے۔ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور اسے تین چار دنوں بعد گھر بھیج دیا جائے گا۔

تصور کیا جا سکتا ہے کہ ماں کے لاڈلے اور بھولے بھالے بیٹے کی مارے خوف کے کیا حالت ہُوئی ہوگی۔ ان آدمیوں نے اسے چُپ کرانے کے



لئے قتل کی دھمکی دے کر ڈرایا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ اُسے اسی کمرے میں رکھا گیا۔ اسے دُودھ پلایا جاتا اور دونوں وقت پراٹھے کھلاتے جاتے تھے۔

اُسے دن رات کا بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ مسلسل خوف میں وقت گزارتا رہا۔ تین چار دنوں بعد قادر اس کمرے میں آیا۔ لڑکا صرف قادر کو پہچانتا تھا۔ دوسرے دو آدمی اس کے لئے اجنبی تھے۔ قادر گھبرایا ہُوا تھا۔ اس نے ان دونوں آدمیوں کو باہر لے جا کر نہ جانے کیا کہا۔ اندر آکر اُنہوں نے حنیف کو ساتھ لیا اور باہر نکل گئے۔ حنیف نے دیکھا کہ یہ مکان گاؤں کے باہر تھا۔ وہ گاؤں کا نام نہیں جانتا تھا۔ راستے میں حنیف روتا تھا تو یہ آدمی اُسے قتل کی دھمکی دے کر چُپ کرا دیتے تھے۔

پھر اچانک حنیف کا باپ اور ماموں نعمت پہنچ گئے۔

## لڑکے کو بیچنے کے لئے لے چلے

اے۔ایس۔آئی قادر کو پکڑ کر لے آیا۔ اسے بھی ہسپتال لے جا کر مرہم پٹی کرائی گئی۔ تھانے لا کر میں نے اُسے کہا کہ فوراً اقبال جرم کر لے ورنہ اُسے سزا میں ذرا سی بھی رعایت نہیں کرائی جائے گی۔ میں نے اُسے چوہدری سلامت اور کرامت دکھائے جو حوالات میں بند تھے اور اُسے کہا کہ ان دونوں نے اقبالی بیان دے کر سارا الزام اُس پر پھینک دیا ہے۔

میری چال کام کر گئی۔ اُس نے اقبالی بیان دے دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ان چوہدریوں کے بڑے خطرناک اور شرمناک کام بھی کیا کرتا ہے اور اُس کا یارانہ پکے مجرموں کے ساتھ ہے۔ چوہدری سلامت اور کرامت نے اُسے کہا تھا کہ وہ نادرہ کے بیٹے کو کسی وقت ورغلا کر اُس کے گھر میں لائیں گے۔ قادر کا کام یہ تھا کہ وہ لڑکے کو کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر دے گا اور رات کو لڑکے کو فلاں گاؤں میں پہنچا دے گا جہاں وہ دو آدمی موجود تھے۔ وہ عادی مجرم اور سزا یافتہ تھے۔ چوہدری سلامت کا ان کے ساتھ میل جول تھا۔

قادر کو اچھی خاصی اُجرت دی گئی۔ چوہدری سلامت نے انہیں بتایا تھا کہ وہ لڑکے کو صرف چھپا کر رکھیں گے اور اُس کے اشارے پر آزاد کر دیں گے لیکن قید کے دوران اُسے ذرا سی بھی تکلیف نہ دی جاتے۔ ان کی سکیم کامیاب ہو گئی اور لڑکا اُن دونوں تک پہنچا دیا گیا۔ اُسے چوہدری سلامت کی گھوڑی پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ میں نے مولوی کے بعد چوہدری سلامت اور کرامت کو گرفتار کر لیا تو قادر کو پتہ چل گیا۔ وہ اُس گاؤں پہنچا جہاں لڑکا قید تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ چوہدری پکڑے گئے ہیں اس لئے لڑکے کو غائب کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

وہ دونوں جرائم پیشہ تھے۔ اُنہوں نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ لڑکے کا گلا گھونٹ کر لاش کہیں غائب کر دی جاتے لیکن انہیں خیال آ گیا کہ لڑکا خوبصورت ہے اور نو عمر بھی ہے۔ اسے کسی مہاراجے یا نواب کے آدمی کے ہاتھ بیچا جا سکتا ہے۔ وہ ایک بردہ فروش کو جانتے تھے۔ وہ وہاں سے سات آٹھ میل دُور رہتا تھا۔ وہ لڑکے کو لے کر اُسی وقت روانہ ہو گئے۔ قادر اس لالچ سے ساتھ چل پڑا کہ لڑکے کی قیمت میں سے حصّہ وصول کرے گا مگر لڑکے کے باپ اور ماموں نے اُن کی سکیم کامیاب نہ ہونے دی۔

میں نے قادر سے اُن دونوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کر لئے۔ ان کی گرفتاری کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے ساتھ والے علاقے کے تھانیدار کو پیغام بھیج دیا۔ دو روز بعد دونوں ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے آ گئے۔ حنیف نے انہیں پہچان لیا۔

میں نے چار ملزم — قادر، دو جرائم پیشہ اور مولوی — چوہدری سلامت اور کرامت کے سامنے کھڑے کر دیئے اور انہیں کہا کہ وہ اقبالی بیان دیں گے یا نہیں۔ دونوں نے انکار کر دیا۔

"ملک صاحب!" — چوہدری سلامت نے مجھے کہا — "ہم نے اپنی بہن کی خاطر یہ کام کروایا تھا۔ اپنے بھائی لطیف اور نادرہ کا ہم تعلق توڑنا چاہتے تھے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ہم دونوں بھائی کوئی بیان نہیں دیں گے۔ ہمارا جُرم



ثابت کر لو۔"

جُرم ثابت کرنے میں مجھے بہت ہی محنت کرنی پڑی۔ شہادت کی بعض ضروری کڑیاں کمزور تھیں۔ انہیں بڑی مشکل سے مضبوط کیا۔ خانہ پُری کی اور جو کسر رہ گئی تھی وہ سرکاری وکیل کی قابلیت نے پوری کر دی۔ دونوں بھائیوں کو چار چار سال، مولوی کو دو سال، قادر کو پانچ سال اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو سات سات سال سزائے قید ہوئی۔

اس کیس کا سب سے زیادہ خوشگوار پہلو یہ تھا کہ نادرہ اپنے خاوند کے پاس چلی گئی پھر اُسے اور اُس کی ماں کو جو بڑھاپے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو چکی تھی اپنے گھر لے آئی۔

# پیار کا پُل صراط

عورت کی فطرت کے متعلق شاعروں اور افسانہ نویسوں نے طرح طرح کے فلسفے گھڑے ہیں۔ وہ دل بہلاتے ہیں تو عورت سے، کوستے ہیں تو عورت کو اور میں ذاتی طور پر یہی کہوں گا جو کسی نے کہا تھا —— ان کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

مَیں نے ایک بار ایسے ہی ایک افسانہ نویس کے الفاظ پڑھے تھے —— "عورت ماں ہے، عورت بہن ہے، عورت بیٹی ہے، عورت بیوی ہے، عورت طوائف ہے، عورت ایک معمّہ ہے"—— اس کے بعد میں نے یہ الفاظ کئی افسانہ نویسوں کے افسانوں میں پڑھے۔

ہے کوئی مطلب ان الفاظ کا؟ الفاظ کی شعبدہ بازی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ایسا کیوں نہیں کہتے —— "مرد چور ہے۔ ماں کا بھی زیور چُرا کر جُوے میں ہار آتا ہے۔ مرد بھائی ہے۔ اپنی بہن برقعے میں جا رہی ہو تو اُسی پر فقرے چُست کرتا ہے۔ مرد بیٹا ہے۔ چوری چھپے سگریٹ پیتا اور ذہنی لذّت پرستی سے دل بہلاتا ہے۔ مرد خاوند ہے۔ بیوی کو دھوکے دیتا اور طوائفوں کے ہاں جاتا ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرد ایسا معمّہ ہے جو حل ہو چکا ہے۔ مرد راشی ہے، زانی ہے، فریبی ہے۔"

کون کیا ہے، یہ کسی ماہر نفسیات سے نہیں کسی تھانیدار سے پوچھتے، یا کسی بھی جیل خانے میں جا کر دیکھتے۔ ایک ہزار قیدیوں میں قیدی عورتیں مشکل سے بیس ہوں گی۔ ان بیس کے کیس دیکھتے تو پندرہ عورتیں ایسی



ہوں گی جنہیں مرد نے مجرم بنایا ہے۔

میں فلاسفر نہیں تھانیدار تھا۔ نفسیات کا کچھ کتابی علم حاصل کیا تھا۔ میں ایک کہانی سُنا دیتا ہوں۔ رائے آپ خود قائم کریں۔

ایک خُوبرو اور بڑے اچھے جسم اور دلکش قد کا آدمی اپنے باپ کے ساتھ تھانے میں آیا۔ کہنے لگا بیوی لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس نے اپنا نام رزّاق بتایا۔ عمر چھبیس سال کے اِدھر اُدھر ہو گی۔ مجھے فوری طور پر یہ خیال آیا کہ ایسے آدمی کی بیوی بھاگ نہیں سکتی۔ اس شخص کے چہرے مہرے اور جسم میں عورت کے لئے کشش تھی۔ اس کی بیوی کو اغوا کیا گیا ہو گا۔

جیسا کہ لوگوں کا دستور ہے، پہلے خود اُسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اگلی رات بھی نہ آئی تو صبح میرے پاس آئے۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ لاپتہ یوں ہوئی کہ صبح دیکھا، وہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ باہر کے دروازے کی اندرونی زنجیر اُتری ہوئی تھی۔ کواڑ بند تھے۔

"اُس کی جُوتی اُس کی چارپائی کے پاس پڑی تھی؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں" —— رزّاق نے جواب دیا —— "جُوتی پہن کر گئی ہے۔"

"گھر میں زیورات، پیسے وغیرہ دیکھے ہیں؟"

"دیکھے ہیں" —— اُس نے بتایا —— "وہ کچھ بھی لے کر نہیں گئی۔"

"اپنا زیور لے گئی ہو گی۔"

"وہ بھی نہیں" —— اُس نے کہا۔

مجھے خیال آیا کہ اُسے کوئی اُٹھا کر لے جاتا تو اُس کی جُوتی پیچھے رہ جاتی۔ اگر اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہوتی تو زیور اور پیسے ضرور لے جاتی۔

"تم باپ بیٹا کیا سمجھتے ہو کہ اغوا ہوئی ہے یا خود گئی ہے؟"

دونوں چُپ رہے جیسے انہیں جواب سُوجھ نہ رہا ہو یا صحیح جواب دینے سے ہچکچا رہے ہوں۔

"مجھ سے چھپاؤ گے تو اپنی بیوی کو ساری عمر واپس نہیں لے سکو گے" — میں نے کہا — "اگر وہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ خاوند کا بیوی کو چھوڑ کر یا بیوی کا خاوند کو چھوڑ کر بھاگ جانا جُرم ہے۔ مجھے دل کی باتیں بتا دو۔ اُسے پکڑنا کوئی مشکل نہیں"۔

"ایسا کوئی آدمی میرے سامنے نہیں آتا" — رزّاق نے کہا۔

ایک عام سوال ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ اُنہوں نے ایک خاندان کا نام لے کر کہا کہ اُس کے ساتھ پُرانی دشمنی ہے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ واردات ایک قصبے کی ہے۔ یہ تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ آڑھت کی منڈی بھی۔ ہندو اور سکھ کاروباری لوگ تھے۔ مسلمانوں کی آبادی نصف سے ذرا کم تھی۔ ان میں بھی کاروباری لوگ اور دکاندار تھے۔ ملازمت پیشہ بھی تھے اور زمیندار بھی۔ ان کی زمینیں قصبے کے اِردگرد اور کچھ دُور بھی تھیں۔ جس خاندان کی لڑکی لاپتہ ہو گئی تھی یہ لوگ خوشحال زمیندار تھے اور ان کی جس خاندان کے ساتھ دشمنی تھی وہ بھی زمیندار تھے۔

رزّاق اور اُس کے باپ نے دشمنی کی تفصیل یہ سنائی کہ ان میں لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ دونوں طرف سے ایک ایک آدمی قتل ہو چکا ہے۔ ان میں صلح کے معاہدے اور راضی نامے بھی ہوتے رہے ہیں۔ ان کی دشمنی کو ہندو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندو کے ساتھ کسی مسلمان کی دوستی ہو تو بھی ہندو ہونے کی وجہ سے ہندو مسلمان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہندو ان دونوں خاندانوں یا برادریوں کے دوست بن کر انہیں آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ مسلمان اِن ہندوؤں کی یہ چال کبھی بھی نہ سمجھ سکے۔

مجھے اس تھانے میں آتے ہوتے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اِن خاندانوں کی دشمنی میرے آنے سے پہلے ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ ان کی آخری واردات (میرے آنے سے پہلے) اس طرح ہوئی تھی کہ دوسرے خاندان نے رزّاق کے رشتہ داروں میں سے ایک جوان عورت اغوا کر لی تھی۔ عورت والوں کو پتہ چل گیا کہ عورت کہاں ہے اور کس نے اغوا کی ہے۔ رزّاق کی برادری نے



دن کے وقت اُن کی دو لڑکیاں کھیتوں سے اُٹھا لیں اور کہیں چھپا کر اعلان کیا کہ لڑکیاں ہمارے پاس ہیں اور انہیں ہم نے بالکل ننگا رکھا ہوا ہے۔ کسی میں ہمّت ہے تو لڑکیوں کو چھڑا لے جائے۔

اُس وقت یہاں ایک ہندو تھانیدار ہوتا تھا۔ اُس تک رپورٹ گئی۔ اُس نے دونوں پارٹیوں کو بلایا اور شرم دلا کر عورت اور لڑکیوں کو آزاد کرا کے وارثوں کے حوالے کیں، پھر دونوں پارٹیوں سے نیک چلنی کی ضمانت لے کر ان کا راضی نامہ کرا دیا۔ اس کے بعد رزاق کے خاندان کے دشمن خاندان نے سر نہ اُٹھایا۔ انہیں چوٹ بڑی سخت پڑی تھی۔ انہیں ایک ویران کوٹھا بتا کر کہا گیا تھا کہ وہاں سے اپنی لڑکیاں لے آؤ۔ وہاں گئے تو دونوں لڑکیاں جو نوجوان تھیں بالکل برہنہ حالت میں اندر بیٹھی رو رہی تھیں۔

## ہنسنے کھیلنے کی شوقین تھی

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی کو اُس خاندان نے اغوا کیا ہو؟" — میں نے رزّاق سے پوچھا۔

"توبہ کرو جی!" — اُس کے باپ نے جواب دیا — "وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتے کہ گھر میں آ کر ہماری کسی عورت کو اُٹھا کر لے جائیں"۔

"یہ بات تم یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

"دراصل جی وہ جو ہماری عورت اُنہوں نے اغوا کر لی تھی وہ اُن کے ایک آدمی کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی تھی" — رزّاق نے کہا — "ہمیں بہانہ مل گیا۔ ہم نے اُن کی دو لڑکیاں اُٹھا لیں۔ دلیری تو ہم نے کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ نہ ہمارا پیشہ جُرم کرنا ہے نہ وہ چور اور ڈاکو ہیں۔ آپس کی دشمنی ہے۔ یہ بھی سمجھو کہ پُرانی بات ہو گئی ہے۔ چار سال سے ہماری آپس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ناراضگی تو قائم ہے۔ ہم ایک دوسرے کے جنازے میں بھی شامل نہیں ہوتے"۔

اُس نے تو یہ بات کہہ دی لیکن میں نے یہ شک اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔ بے شک چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اُن دو لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک ہُوا تھا وہ غیرت والوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

"اگر کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ گھر سے کسی عورت کو اُٹھا کر لے جاتے تو عورت اپنی مرضی سے گئی ہوگی" ـــــ میں نے کہا اور رزّاق کے باپ سے کہا کہ وہ باہر جا کر بیٹھے۔ باپ چلا گیا تو میں نے رزّاق سے کہا ـــــ "اب میرے ساتھ وہ باتیں کرو جو تم اپنے باپ کے سامنے نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ رات تم سب کہاں سوتے تھے اور تمہاری بیوی کی چارپائی کہاں تھی؟"

اُن دنوں رات کو خنکی ہوجاتی تھی اس لئے لوگ برآمدوں میں سوتے تھے۔ صحن میں سونے والے کمبل وغیرہ لیتے تھے۔ رزّاق اور اُس کی بیوی کی چارپائیاں برآمدے میں تھیں۔ رزّاق کی ماں، اُس کے باپ اور دو بھائیوں کی چارپائیاں صحن میں تھیں۔ اُس نے گھر کا نقشہ بھی بتایا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔

"ہوسکتا ہے" ـــــ رزّاق نے کہا ـــــ "سچی بات یہ ہے کہ میں اُسے طلاق دینا چاہتا تھا لیکن اُس کے باپ اور بھائیوں نے مجھے ایسی دھمکی دی تھی کہ میں طلاق دینے کی جرأت نہ کر سکا۔"

"بدچلن تھی؟"

"ثبوت کسی کے بھی پاس نہیں" ـــــ رزّاق نے کہا ـــــ "لیکن اُس کی باتیں اور حرکتیں ایسی ہیں کہ ہر کوئی اُس کے چال چلن پر شک کرتا ہے۔ بہت شوخ ہے۔ ہنسنے کھیلنے کی شوقین ہے۔ مردوں کے سامنے بھی جو بکواس مُنہ میں آتے کر دیتی ہے۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"

"تین سال۔"

"بچے؟"

"بچہ کوئی نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ ماں باپ کی بگڑی



ہوتی ہے۔"

میں نے اُس سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ بہت جرح کی۔ اس سے مجھے یہ معلوم ہُوا کہ رزّاق سخت طبیعت انسان ہے اور اُس کی ماں کا سلوک بھی رزّاق کی بیوی کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ رزّاق نے ایسا کوئی اعتراف تو نہیں کیا تھا۔ یہ میرا اپنا قیاس تھا۔ مجھے رزّاق کے گھر جا کر دیکھنا تھا کہ مکان کیسا ہے اور کسی سوتے ہوتے فرد کو کلوروفارم سنگھا کر یا سوتے ہوتے کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر اُٹھا لے جانا ممکن ہے یا نہیں۔

میرے پوچھنے پر اُس نے اپنی بیوی کا حُلیہ یہ بتایا۔ عمر تیئس سال سے دو چار ماہ اِدھر یا اُدھر۔ رنگ گورا۔ آنکھیں سیاہی مائل شربتی۔ قد لمبوترا اور چھریرا۔ نقش کشش والے۔ اس حُلیے نے میرے ذہن میں کچھ شکوک پیدا کیے لیکن حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ رزّاق خوبرو جوان تھا، پھر اس کی بیوی بھاگی کیوں؟ اُس نے بیوی کا نام شمیم بتایا۔

## چالاک، مکّار، شیطان فطرت عورت

میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ تین آدمی بڑے غصّے میں تھانے میں آتے۔ وہ برآمدے میں شور شرابہ کر رہے تھے۔ میں سمجھا کہ کوئی اور کیس آیا ہے لیکن پتہ چلا کہ شمیم کا باپ ہے اور اُس کے ساتھ شمیم کے دو بھائی تھے۔ وہ رزّاق کے باپ کو جو برآمدے میں بیٹھا تھا گالیاں دے رہے تھے۔ تینوں میرے کمرے میں آگئے اور رزّاق پر طعنوں کی بوچھاڑیں مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ رزّاق بالکل ہی دبک گیا تھا۔ میں نے انہیں ڈانٹ کر چُپ کرایا۔ بھائی تو چُپ ہوگئے باپ بولتا رہا۔ یہ لوگ اچھی حیثیت کے مالک تھے۔

"ملک صاحب!" ـــــ شمیم کے باپ نے کہا ـــــ "اگر یہ شخص (رزّاق) کہے کہ میری بیٹی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ نکل گئی ہے تو سمجھو بکواس

کرتا ہے۔"

"وہ گھر سے اپنی مرضی سے ہی گئی ہوگی" — شمیم کے بڑے بھائی نے کہا — "لیکن وہ ندی میں ڈوب مری ہوگی۔ اگر ریل گاڑی کے نیچے آکر مرتی تو لاش لائن پر پڑی مل جاتی۔"

"تمہارا مطلب ہے اُس نے خودکشی کر لی ہوگی؟ .... کیوں؟"

"یہ رزاق اُسے بدچلنی کے طعنے دیتا رہتا تھا اور اُسے اس نے تین چار بار مارا پیٹا بھی ہے" — بڑے بھائی نے جواب دیا — "اس کی ماں نے تو ہماری بہن کا جینا حرام کر رکھا تھا۔"

"وہ اپنے سسرال میں بہت تنگ تھی" — شمیم کے چھوٹے بھائی نے کہا — "ہماری ماں نے آج ہمیں بتایا ہے کہ ہماری بہن نے دو روز پہلے ماں سے کہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لے گی۔"

کبھی وہ تینوں بولنے لگتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان تینوں میں ذرا عقل والا کون ہے۔ مجھے چھوٹا بھائی اپنے باپ اور بڑے بھائی سے بہتر نظر آیا۔ میں نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اُس کے باپ، بڑے بھائی اور رزاق سے کہا کہ وہ باہر بیٹھیں۔

یہ بھائی جس کا نام منظور تھا شمیم سے دو سال چھوٹا تھا۔ اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان کی زمین میں سبزیوں کا باغ بھی تھا۔ منظور دس جماعتیں پاس تھا جو اُس زمانے میں بہت زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے کچھ اور ہی شک ہو رہا ہے اس لئے وہ مجھے بتاتے کہ اصل حالات کیا ہیں۔

اُس نے جو بڑی لمبی بات سنائی اس کا اختصار یہ ہے کہ اُس کی بہن شمیم مظلوم تھی۔ ان کا باپ وہمی اور شکی مزاج انسان تھا۔ اُس نے شمیم کو لڑکپن سے روکنا ٹوکنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی اولاد کے لئے روک ٹوک ہونی چاہیئے لیکن شمیم کے باپ کی روک ٹوک میں طنز، ڈانٹ اور الزام تراشی ہوتی تھی۔ شمیم جوان ہو گئی تو بھی باپ نے اپنا رویّہ نہ بدلا بلکہ رویّہ اور زیادہ سخت اور



تُرش کر دیا۔ بڑا بھائی شمیم کو ڈانٹ ڈپٹ تو نہیں کرتا تھا لیکن ناروا قسم کی روک ٹوک کرتا تھا۔

شمیم کو بجھ کے رہ جانا چاہیئے تھا لیکن وہ شوخ اور شرارتی ہو گئی۔ باپ گھر میں موجود نہ ہوتا تو وہ دبکی رہتی اور اُس کی غیر حاضری میں وہ اُچھل کود شروع کر دیتی۔ سہیلیوں کے ساتھ تو وہ بہت ہی شرارتی بن جاتی تھی۔ اُسے اپنے گھر میں جو گھٹن ملتی تھی اس کا علاج اُس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ہنسو اور ہنساؤ۔ وہ کچھ لڑاکی بھی ہو گئی تھی اور اُس کے دل سے ڈر خوف نکل گیا تھا۔

اُس کی شادی ہوئی تو وہ بہت خوش تھی کہ باپ کی پھٹکار سے آزادی ملی۔ وہ پہلے سے زیادہ کھلنڈری ہو گئی۔ مذاق میں وہ جو مُنہ میں آئے کہہ ڈالتی اور قہقہے لگاتی تھی۔ مردوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے بھی باز نہیں آتی تھی شادی یہیں ہوئی۔ سسرال اسی محلے میں تھا۔ شمیم اپنے گھر آتی رہتی تھی لیکن باپ نے پہلے والی ٹوکا ٹاکی جاری رکھی مگر وہ زیادہ عرصہ خوش نہ رہ سکی۔ اُس نے ماں کو اور منظور کو بتایا کہ اُس کے خاوند رزّاق نے بھی اُسے جا بجا طعنہ آمیز لہجے میں ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔

شمیم کی ساس (جیسا کہ میں نے بھی بعد میں دیکھا) چالاک، مکّار اور شیطان فطرت عورت تھی۔ وہ شمیم کے خلاف رزّاق کے کانوں میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتی تھی اور رزّاق شمیم پر برس پڑتا تھا۔ اس گھر میں بھی وہ قباحت شروع ہو گئی جو ہمارے معاشرے میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ ہے ساس بہو کی معرکہ آرائی۔ ساس اپنی بہو کو اپنے گھر کے فرد کا درجہ نہیں دیتی۔ چالاک قسم کی ساسیں اپنے بیٹوں کو بہوؤں کے خلاف باتوں کے بتنگڑ بنا کر سناتی ہیں اور میاں بیوی کے درمیان شکوک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ساسیں مظلوم بن کر اپنے بیٹوں کو اپنی بہوؤں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔

شمیم پہلے ہی زبان دراز تھی۔ وہ ساس کے مقابلے پر اُتر آئی۔ اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ رزّاق اُس سے بدظن ہو گیا۔ رزّاق کی ماں نے شمیم پر گھٹیا الزام عائد کئے اور نوبت

طلاق تک پہنچا دی۔ رزاق نے جب پہلی بار شمیم کو طلاق کی دھمکی دی تو اُس کا باپ اور دونوں بھائی مرنے مارنے کے لئے رزاق کے گھر جا دھمکے اور اُسے کہا کہ وہ اپنی زندگی ختم کرنا چاہتا ہے تو ان کی بہن کو طلاق دے دے ۔۔۔ رزاق ڈر گیا۔

وہ کچھ دن ڈر میں رہا۔ اس کے بعد اُس نے شمیم کے ساتھ پھر وہی سلوک شروع کر دیا۔ اُسے دراصل ماں گمراہ کرتی رہتی تھی۔ منظور نے مجھے بتایا کہ کچھ دنوں سے شمیم زیادہ پریشان اور غصیلی رہنے لگی تھی۔ گمشدگی کی رات سے ایک روز پہلے وہ گھر آئی تو باپ نے حسبِ عادت اُسے ڈانٹ دیا کہ تین سال شادی کو ہو گئے ہیں اور وہ ابھی تک کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔ ماں نے بھی دو چار چبھتی ہوئی سنا دیں۔ وجہ یہ تھی کہ شمیم کے باپ اور ماں کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی جو ان کا معمول تھا۔ دونوں غصے میں تھے۔ شمیم اپنا رونا رونے آئی تھی اور ماں باپ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی۔

## ماں کا چلن مشکوک تھا

"تین سال گزر گئے ہیں" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "کوئی بچہ بھی نہیں ہُوا"

"یہ بھی ہماری بہن کا جُرم ہے" ۔۔۔ منظور نے کہا ۔۔۔ "عورتوں سے پتہ چلا ہے کہ رزاق کی ماں کہتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرائے گی"

میں نے رزاق کے متعلق سوچا کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت جوان ہے لیکن اندر سے کتنا کھوکھلا کہ ماں جو کان میں ڈالتی ہے اُسی کو سچ سمجھ کر اپنی بیوی کو مجرم کہہ دیتا ہے۔ میں نے منظور سے کہا کہ رزاق جیسے خوبصورت جوان کو رعب والا ہونا چاہیئے۔

"یہ تو اتنے رُعب والا آدمی تھا کہ ہمارے دشمن اسے دیکھ کر پرے



ہو جاتے تھے" ۔۔۔ منظور نے کہا ۔۔۔ "جسم سے زیادہ تو اس کے دماغ میں طاقت تھی۔ دلیر اور زبردست لٹھ باز تھا۔ اپنی سوچتا اور اپنی بات منواتا تھا۔ ہم سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ چھ سات سال ہوئے دشمنوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ دونوں طرف آدمی زخمی ہوئے تھے۔ تھانیدار نے راضی نامہ کرا دیا لیکن رزاق اور اس کے بڑے بھائی نے ذرا سی بات پر دشمنوں کا ایک آدمی سب کے سامنے قتل کر دیا ۔۔۔

"دونوں بھائی پکڑے گئے۔ پھر ہُوا یہ کہ رزاق بری ہو گیا اور بڑے بھائی کو پھانسی ہو گئی۔ رزاق کی یہ حالت ہو گئی جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ چیختا اور چلاتا تھا کہ مجھے میرے بھائی کے ساتھ پھانسی دو۔ اس کے بعد رزاق بالکل بدل گیا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اس میں عقل ہے ہی نہیں۔ اس کا رُعب داب ختم ہو گیا۔ دلیری ختم ہو گئی پھر ماں نے اس کے دماغ پر قبضہ کر لیا"

مَیں نے سوچا کہ شمیم رزاق کو پسند نہ کرتی تو اُس نے بھاگنے کے لئے تین سال انتظار کیوں کیا؟ ہو سکتا ہے اُس نے خاوند کی جھک جھک سے تنگ آ کر کسی کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا ہو۔ یہ نفسیاتی معاملے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ شمیم کو باپ کی طرف سے پھٹکار اور الزام تراشی ملتی تھی۔ خاوند کا بھی یہی سلوک تھا اور ساس نے اُس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ان تلخیوں میں آئے ہوتے انسان اپنی تسکین اور فرار کا کوئی ذریعہ پیدا کر لیتے ہیں۔ خاوند ہو یا بیوی وہ درپردہ دوستی لگا لیتے ہیں۔

مجھے کچھ ایسا ہی شک ہونے لگا تھا۔ شمیم ہنسنے کھیلنے والی زندہ دل لڑکی تھی۔ اُس نے اپنے جیسا کوئی ڈھونڈ لیا ہوگا۔ مجھے خودکشی کا شک بھی تھا لیکن پختہ نہیں۔

میں اِن سب کو ساتھ لے کر رزاق کے گھر چلا گیا۔ یہ گاؤں نہیں تھا۔ دیہاتی مکانوں کے صحن کے ارد گرد دیوار ہوتی ہے جو عموماً پھلانگ لی جاتی ہے۔ یہ قصبے یا شہر کا مکان تھا۔ گلی کی طرف بھی کمرے تھے۔ مکان تین اطراف سے دوسرے مکانوں سے ملا ہُوا تھا۔ میں نے اُوپر جا کر دیکھا۔ ساتھ والے مکانوں

کی چھتیں دیکھیں۔ کسی بھی طرف سے کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ کوئی آیا ہی تھا تو وہ لڑکی کی مدد اور راہنمائی سے ہی آیا ہوگا لیکن لڑکی کی اگر مدد شامل تھی تو کسی کو اندر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

میں نے چارپائیاں وہاں رکھوائیں جہاں جہاں اُس رات سب سوتے تھے۔ میں نے جائزہ لیا کہ گھر والے اس طرح سوتے ہوئے ہوں تو برآمدے میں سے سوتی ہوئی لڑکی کو کس طرح اُٹھایا جاسکتا ہے۔ مجھے یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

میں رزّاق کی بیٹھک میں بیٹھ گیا۔ شمیم کی ماں کو بُلایا۔ وہ رزّاق کی ماں کو کوستی رہی۔ اُس سے کوئی نئی بات یا سراغ کی کوئی بات معلوم نہ ہوسکی سوائے اس کے کہ شمیم نے اُسے کہا تھا کہ اس زندگی سے تو اُس کا مرجانا ہی اچھا ہے۔ وہ اپنے سُسرال سے تنگ آچکی تھی اور اپنے باپ سے بھی خوش نہیں تھی۔

رزّاق کی ماں کو بلایا۔ وہ شمیم کی ماں سے بھی زیادہ گھٹیا باتیں کرتی تھی۔ شمیم کو بدچلن اور بدمعاش کہتی تھی۔ اُس کی ماں کو بھی بدکار کہتی تھی۔ میں اُس سے پوچھتا تھا کہ شمیم کے تعلقات کس آدمی کے ساتھ ہیں مگر وہ کسی کا نام نہیں بتاسکتی تھی۔ کبھی کہتی ــــ "ایک ہو تو بتاؤں" ــــ میں نے آخر تنگ آکر اُسے کہا کہ وہ تمہارے سلوک سے تنگ آکر بھاگ گئی ہے اور تم نے اپنے بیٹے کا گھر اُجاڑ دیا ہے۔

میں نے محلّے کے تین چار معزز افراد کو بُلایا اور اُنہیں کہا کہ اس طرح کسی لڑکی کا لاپتہ یا اغوا ہوجانا معمولی بات نہیں۔ اگر اُنہوں نے میری مدد نہ کی تو ان میں سے کسی کے گھر کی لڑکی بھی اٹھائی جاسکتی ہے یا یہ سمجھ کر بھاگ سکتی ہے کہ پکڑی نہیں جاسکے گی۔

ان معززین کی اپنی اپنی دوستیاں اور دشمنیاں تھیں۔ میں نے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ بات کی۔ پہلے شاید کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ معززین کی یہ خاص قسم ہوتی ہے۔ یہ لوگ تھانیداروں کے خوشامدی ہوتے ہیں۔ ہر گھر کی خبر رکھتے ہیں اور درپردہ مُخبری کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف بھی مُخبری کرتے ہیں۔



ان لوگوں سے مجھے پتہ چلا کہ شمیم شوخ اور شرارتی تھی۔ اس قسم کی عورتیں بدنام ہوجاتی ہیں لیکن شمیم کے متعلق یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ فلاں کے ساتھ اُس کے درپردہ مراسم ہیں۔ البتہ شمیم کی ماں کے متعلق سب نے کہا کہ شادی سے پہلے بھی چال چلن کی اچھی نہیں تھی اور شادی کرکے بھی کچھ عرصہ ایسی ہی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ شمیم کا باپ شمیم کو روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ جو کرتا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ اُس کی اپنی بیوی اخلاق کی اچھی نہیں تھی۔ ابتدا میں وہ اپنی بیوی کی پٹائی بھی کردیا کرتا تھا۔

## وہ باپ بننے کے قابل نہ تھا

اس قسم کے کیسوں میں کئی طرح کی کارروائیاں کرنی ہوتی ہیں۔ تھانے میں اور بھی کیس تھے جن میں تین چار زیادہ ضروری تھے۔ شمیم کی گمشدگی کی ضروری کاغذی کارروائیاں کیں۔ مُخبروں سے رپورٹیں لیتا رہا۔ تیسرے چوتھے روز میں نے ادھر توجہ دی تو خیال آیا کہ شمیم کی سہیلیاں بھی ہوں گی۔ ہر جوان لڑکی کی ایک ہمراز سہیلی ضرور ہوتی ہے۔

میں شمیم کے ماں باپ کے گھر چلا گیا اور اُس کی ماں سے شمیم کی سہیلیوں کے نام پتے معلوم کئے۔ وہ اسی محلّے میں رہتی تھیں۔ پہلے ان تینوں کے باپوں کو بلایا اور انہیں کہہ دیا کہ وہ بھی بیٹیوں والے ہیں۔ اگر بیٹیوں کے لاپتہ ہونے کی یہی رسم چل نکلی تو کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ اس سے پہلے بھی میں انہیں بہت کچھ کہہ چکا تھا۔ اب کہا کہ اُن کی بیٹیاں شمیم کی سہیلیاں تھیں۔ انہیں یہ سمجھا بجھا کر اور تسلّی دے کر میرے پاس لے آئیں کہ شمیم کی درپردہ زندگی کے متعلق جو کچھ بھی جانتی ہیں مجھے بتادیں اور مجھ سے ڈریں جھجکیں نہیں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ تینوں لڑکیاں اپنے باپوں کے ساتھ آگئیں۔ میں نے اکیلی اکیلی کو اندر اپنے پاس بٹھایا اور ہر ایک سے ایک جیسے

سوال پوچھے۔ تینوں نے کہا کہ شمیم اپنے دُکھ سُکھ انہیں سنایا کرتی تھی اور وہ زندگی سے بیزار ہو گئی تھی۔ ان لڑکیوں نے وہی باتیں بتائیں جو میں آپ کو دوسروں کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ کہتی تھی کہ خدا کا شکر ہے کہ میرا بچہ نہیں ہے ورنہ میں اپنی جان نہ لے سکتی۔ ان لڑکیوں کے خیال کے مطابق اُس نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے خاوند کے متعلق اُس نے بتایا تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا، ماں خواہ اس کی دس شادیاں کرا دے۔ شمیم کو زندگی سے بیزار کرنے میں اس محرومی کا ہاتھ بھی تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔

ان تین لڑکیوں میں ایک ایسی تھی جس کے ساتھ شمیم ہر ایک بات کرتی تھی۔ اُس سے میں نے پوچھا کہ شمیم نے اپنے دل بہلاوے کا خفیہ انتظام کر رکھا ہو گا۔ اس لڑکی نے قسمیں کھا کر بتایا کہ وہ ایسی نہیں تھی۔ چونکہ وہ ایسی نہیں تھی اس لئے ایسا کوئی الزام برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے ان لڑکیوں کے ساتھ بہت وقت لگایا مگر اس کے سوا مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا کہ شمیم اتنی تنگ آ چکی تھی کہ اُس نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ خودکشی کس طرح کرے گی۔ خودکشی کا خیال تو میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن ثبوت نہیں ملتا تھا۔ اب ان لڑکیوں نے خودکشی کی بات کی تو میرا شک پختہ ہو گیا کہ شمیم نے خودکشی کی ہے۔ قریب سے ایک ندی گزرتی تھی۔ قصبے کے قریب آکر یہ تنگ ہو گئی تھی اس لئے وہاں پانی گہرا تھا اور تیز بھی۔ اگر شمیم اس میں کود گئی تھی تو لاش بہت دُور نکل گئی تھی۔

میں تھانے گیا اور اُن تھانوں کو جن کے علاقوں سے ندی گزرتی تھی اطلاع بھجوائی کہ کسی جوان لڑکی کی لاش ملی ہو تو مجھے اطلاع دی جائے۔

تھانے میں اور بھی کام تھے۔ میں اُن میں مصروف ہو گیا۔



# خاوند کا اغوا اور طلاق

ایک دن اور ایک رات گزر گئی۔ صبح ہوتی تو رزاق گھبرایا ہوا تھانے میں آیا۔ اُس نے بتایا کہ گزشتہ رات وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے کے لئے اُس کا بھائی اُٹھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر آکر رزاق سے کہا کہ باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور اُسے بُلا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ بہت ضروری بات ہے۔

رزاق باہر آیا۔ جو آدمی آیا تھا اُس کے سر اور مُنہ پر صافہ لپٹا ہوا تھا۔ اُس نے کہا — "رزاق بھائی! بیوی تمہاری لاپتہ ہوئی تھی؟" — رزاق نے کہا کہ اُسی کی بیوی لاپتہ ہے۔ اس آدمی نے آہستہ سے کہا — "تھوڑی دُور تک آؤ یار! تمہاری قسمت اچھی ہے۔"

وہ آدمی آگے آگے چل پڑا۔ رزاق نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیوی مل گئی ہے یا یہ بتانے آئے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ اُس آدمی نے کہا — "یہ بیوی تم جیسے عزت دار آدمی کے قابل نہیں۔ تم خاندانی آدمی ہو۔"

گلی کا اگلا موڑ دُور نہیں تھا۔ یہ موڑ مڑتے ہی کسی نے رزاق کے سر پر کمبل ڈال دیا۔ بڑی تیزی سے اُس کے گرد رسّی بندھ گئی۔ اُس کے بازو کمبل کے اندر جکڑے گئے۔ ایک رسّی اُس کے مُنہ پر اس طرح باندھ دی گئی کہ رسّی اُس کے مُنہ میں چلی گئی اور گانٹھ پیچھے دے دی گئی۔ اب اُس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ اُسے دو یا تین آدمیوں نے اُٹھا لیا اور وہ گلیوں کے موڑ مُڑنے لگے۔ رزاق نے مجھے بتایا کہ گلیوں سے نکل کر اُسے کھڑا کر دیا گیا اور کہا گیا کہ آرام سے ساتھ چل پڑے ورنہ اُسے وہیں ختم کر دیا جائے گا۔

دو آدمیوں نے اُس کے بازو پکڑ لئے اور اُسے پیدل چلاتے لے گئے۔ رزاق دیکھ تو سکتا نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔ اُسے ساتھ لے جانے والے خاموش تھے۔ ایک جگہ رُک گئے اور اُسے

پھر چلایا گیا۔ اُس نے سُنا جیسے دروازہ کھلا ہو۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ کچھ اور آگے لے جا کر اُسے بٹھا دیا گیا اور رسّیاں کھول کر اُس کے اوپر سے کمبل اُتار دیا گیا

اُس نے جو دیکھا اُس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ایک کمرہ تھا۔ ایک معمولی سی میز پڑی تھی۔ اس پر لالٹین رکھی تھی۔ تین بالکل معمولی اور پُرانی کُرسیاں تھیں۔ دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر اُسے بٹھایا گیا تھا۔ اُس کے دائیں اور بائیں دو آدمی کھڑے تھے۔ دونوں کے سَر اور چہرے صافوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ تیسرا آدمی رزّاق کے سامنے ایک کاغذ رکھ رہا تھا۔ اُس نے بھی چہرہ اور سَر صافے میں چھپا رکھا تھا۔ تینوں نے شلواریں اور کُرتے پہن رکھے تھے۔

اس تیسرے آدمی نے پین رزّاق کے آگے کر کے کہا — "خاموشی سے اپنی بیوی کو طلاق لکھ دو۔"

"بیوی کہاں ہے؟"

"میں نے کہا ہے طلاق لکھ دو" — اس آدمی نے کہا۔

"نہ لکھوں تو؟"

دو آدمیوں نے خنجر نکال لئے۔ تیسرے نے چارپائی کے نیچے ہاتھ کر کے ایک کلہاڑی نکال لی۔

"میری بات ذرا غور سے سُن لو" — اس تیسرے آدمی نے کہا — "دوستی کی بات یہ ہے کہ یہ بیوی اب تمہارے قابل نہیں رہی۔ وہ کسی آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ اگر پولیس اُسے برآمد کر کے تمہارے حوالے کر بھی دے گی تو وہ تم پر لعنت بھیجے گی۔ وہ پھر بھاگ جائے گی۔ کیا تم ایسی بیوی کو گھر میں رکھو گے جو پانچ چھ دنوں سے ایک آدمی کے پاس ہے اور اُس آدمی کو وہ اپنا خاوند بنا چکی ہے؟"

"میں اُس کا قیمہ کر دوں گا" — رزّاق نے غصّے سے کہا۔

"اگر تم طلاق نہیں لکھو گے تو تمہارے جسم کا قیمہ ہو جائے گا" — اس



آدمی نے اُسے کہا — "بے وفا بیوی کی خاطر اپنی جان ضائع نہ کرو۔"

رزّاق آٹھ جماعتیں پاس تھا۔ اُس نے پین ہاتھ میں لے لیا اور بولا — "مجھے معلوم نہیں کہ طلاق نامے میں کیا لکھا جاتا ہے .... اور دوسری بات یہ ہے کہ میں طلاق لکھ دوں گا تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"تمہاری آنکھیں باندھ کر ایک گلی میں چھوڑ آئیں گے" — اُسے جواب ملا — "تم آنکھوں سے کپڑا خود کھول لینا اور گھر چلے جانا۔ تھانے جاؤ گے تو سوائے مصیبت کے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا .... لکھو، میں لکھواتا ہوں۔"

یہ آدمی طلاق نامے کے الفاظ بولتا گیا اور رزّاق لکھتا گیا۔ اُس سے لکھوایا گیا کہ میں اپنی بیوی شمیم دختر فلاں ذات فلاں موضع فلاں کو اس وجہ سے تین طلاق دیتا ہوں کہ بدچلن ہے اور اس کی اولاد بھی نہیں ہوتی۔ میں حق مہر مطالبے پر ادا کرنے کا پابند ہوں۔

"نیچے اپنا نام، ولدیت اور ذات لکھو" — اُسے کہا گیا۔

رزّاق نے اپنا نام وغیرہ لکھ دیا۔

"تاریخ" — ایک اور آدمی بولا۔

رزّاق نے اُس روز کی تاریخ لکھ دی۔

انہوں نے اُس کی آنکھوں پر کپڑا باندھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے۔ رزّاق کو پتہ نہ چل سکا کہ یہ مکان کہاں ہے۔ اُسے کھیتوں میں سے گزارا گیا اور کچھ دُور جا کر اُسے کہا گیا کہ ہم جا رہے ہیں۔ کپڑا کھول کر ہمیں دیکھنے کی ہمت نہ کرنا۔ یہ کہہ کر وہ آدمی دوڑ پڑے۔ رات چاندنی تھی۔ رزّاق نے اپنی آنکھوں سے کپڑا اُتارا۔ تھوڑی دیر تک تو اُسے کچھ نظر ہی نہ آیا۔ جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ آدمی غائب ہو چکے تھے۔

## ہاتھ کا زخم آنکھ کا پھولا

اب کچھ شکوک ختم ہو گئے اور نئے شُبہے پیدا ہوتے۔ یہ بات صاف

ہوگئی کہ شمیم نے خودکشی نہیں کی۔ دو شکوک تھے۔ ایک یہ کہ اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے اور زبردستی طلاق نامہ لکھوا کر اُس کے ساتھ شادی کی جا رہی ہے۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور اپنے خاوند سے زبردستی طلاق لینے کی سکیم میں وہ برابر کی شریک ہے۔ اُسے جتنا تنگ رکھا گیا اور اُسے جو مسلسل ذہنی اذیت ملتی رہی اس کا ردِ عمل ایسا ہی سنگین ہونا چاہیئے تھا۔

میں نے رزاق سے کہا کہ وہ یاد کرنے کی کوشش کرے۔ ذہن پر زور دے۔ اُسے کچھ نہ کچھ یاد آ جائے گا۔ اُن تینوں میں سے کسی ایک کی کوئی نشانی، چال یا کوئی اور چیز یاد آ جائے گی۔ اُس کی ذہنی حالت صحیح نہیں تھی۔ پریشانی اور غصہ اُسے کچھ سوچنے نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ سوال پوچھتا رہا۔ وہ سوچ سوچ کر جواب دیتا رہا۔ وہ کسی کا چہرہ تو پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ سب نے چہرے صافوں میں چھپا رکھے تھے۔ اُن کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

میری مدد اور راہنمائی سے اُسے دو نشانیاں یاد آ گئیں۔ جس نے اُسے پین دیا تھا اُس کے دائیں ہاتھ کی اُلٹی طرف ایک لکیر کی طرح لمبے زخم کا پُرانا نشان تھا۔ ایک آدمی کی ایک آنکھ میں چھوٹا سا سفید پھولا تھا۔ اس آنکھ کا رنگ دوسری آنکھ کی نسبت کم سیاہ تھا۔ تینوں کے رنگ گہرے سانولے تھے۔

"ذرا غور کرو رزاق!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم نے اُن کے ہاتھ دیکھے تھے۔ ایک ہاتھ مزدور اور کسان کے ہوتے ہیں جو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ محنت مزدوری کرنے والا آدمی ہے۔ ایک ہاتھ امیر لوگوں کے، بابو لوگوں کے اور اچھی قسم کے دکانداروں کے ہوتے ہیں۔ یہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ان تینوں کے ہاتھ کیسے تھے؟"

"محنت مزدوری کرنے والے ہاتھ تھے" ـــــ اُس نے بغیر سوچے کہا



ـــــ "دو کے ہاتھ میرے سامنے آئے تھے۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا اور رگیں اُبھری ہوئی تھیں۔"

میں نے اُسے کہا کہ اگر میں اُسے اُس کے گھر سے چلاؤں تو کیا اُسے یاد آ جائے گا کہ وہ کدھر کدھر مُڑا اور اُس مکان تک پہنچا تھا؟ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور یہ کہنے لگا کہ اُسے یاد نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی عقل والے آدمی تھے جو اُسے ویسے ہی گھماتے موڑتے رہے تاکہ اُسے راستہ یاد نہ رہے۔ ایسی احتیاط عادی مجرم ہی کر سکتے ہیں لیکن استاد ایسی بے احتیاطی نہیں کیا کرتے کہ ہاتھ اور آنکھ کی اتنی نمایاں نشانیاں کسی کو دکھاتے۔ لیکن جُرم ایسی حرکت ہے کہ بڑے نامی گرامی استادوں سے بھی کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے اور وہ پکڑے جاتے ہیں۔ جرم ہضم نہیں ہوتا۔ آپ کتاب میں کسی جرم کا طریقہ پڑھ کر وہ جُرم کریں یا کسی اُستاد کی شاگردی کر کے جرم کریں۔ آپ دو یا تین بار کامیاب ہوں گے۔ اس کے بعد آپ کا پکڑا جانا لازمی ہے بشرطیکہ آپ کو پولیس کی مدد حاصل نہ ہو۔

مجھے اچانک خیال آ گیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس نے طلاق نامے پر تاریخ کیا لکھی تھی۔

"کل کی" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

میں نے اپنے تھانے میں عادی مجرموں اور سزا یافتہ آدمیوں کا ریکارڈ دیکھا۔ ان لوگوں کے حُلیے بھی لکھے ہوئے تھے۔ سارا ریکارڈ دیکھ مارا۔ کسی ایک کے بھی ہاتھ پر لمبے کٹ کا نشان اور آنکھ میں پھولا نہیں تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ حُلیے یا شناختی نشانات میں یہ نشان بھی لکھے جاتے۔ عموماً تل لکھے جاتے ہیں۔ زخم کا نشان چہرے پر ہو تو ضرور لکھا جاتا ہے۔

میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبلوں سے پوچھا کہ ہاتھ کے زخم والا اور آنکھ کے پھولے والا کوئی آدمی یعنی دو مختلف آدمی اپنے ریکارڈ پر ہیں؟ انہیں میں نے واردات سنائی تو ایک ہیڈ کانسٹیبل نے ساتھ والے علاقے کے تھانے کا نام لے کر کہا کہ وہاں ایک آدمی

ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے اُس نے ایک واردات ہمارے علاقے میں بھی کی تھی لیکن عدمِ ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو بار کا سزا یافتہ تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اُس کے گاؤں کا نام بھی بتایا۔ رزّاق ابھی تھانے میں تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اس آدمی کا قد بُت ہیڈ کانسٹیبل کو بتائے۔ اُس نے بتایا تو ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہی ہو۔ قد بُت تو ہزاروں کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بہرحال پولیس کی تفتیش شک پر ہی ہوتی ہے۔ میرے لئے اس آدمی کو دیکھنا ضروری تھا۔ میری چھٹی حس نے میری رہنمائی کی اور میں نے اُسے لانے کا فیصلہ کر لیا۔

## پھولا بادشاہ اور گلّو

دوسرا تھانہ کم و بیش دس میل دُور تھا۔ میں نے ٹیلیفون سے بات کرنے کی بجائے ہیڈ کانسٹیبل ہردیال کو اُس تھانے میں بھیجا۔ سرکاری طریقۂ کار تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن دفتری کارروائیوں میں پڑ جائیں تو ملزم کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ وقت بچانے کے لئے مختلف علاقوں کے تھانیدار ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا کرتے تھے۔

میں نے اپنے قصبے کے تین ایسے ہسٹری شیٹر بلائے جو مُخبری بھی کرتے تھے۔ ان میں سے دو آ گئے۔ تیسرا نہ مل سکا۔ ان سے پوچھا کہ ساتھ والے علاقے کا اور فلاں گاؤں کا رہنے والا وہ کون ہے جس کی آنکھ میں پھولا ہے۔ سزا یافتہ ہے۔

"آنکھ کے پھولے کی وجہ سے اُس کا نام ہی پھولا بادشاہ پڑ گیا ہے" — ایک جرائم پیشہ مخبر نے کہا اور دوسرے نے ہنس کر تائید کی۔ اُس نے کہا — "کہیں ہاتھ مار گیا ہے؟"

"اور ایک اور ہے جس کے دائیں ہاتھ کی اُلٹی طرف لمبا کٹ ہے" — میں نے پوچھا — "اُسے جانتے ہو؟"

دونوں نے سوچ کر سر ہلا دیئے۔ وہ ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتے



تھے۔ البتہ ایک نے یہ خبر سنائی کہ پھولا بادشاہ کو اُس نے کل یہاں دیکھا تھا۔ وہ اُسے بازار میں نظر آیا تھا

"کہاں تھا؟" — میں نے پوچھا — "کیا کر رہا تھا؟"

"ایک ہندو آڑھتی کا ایک مزدور ہے" — میرے ایک آدمی نے جواب دیا — "اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔"

"اس مزدور کو آپ صرف مزدور ہی نہ سمجھیں" — میرے دوسرے آدمی نے کہا — "کھلاڑی ہے۔ اُس کے یارانے بھی استادوں کے ساتھ ہیں۔"

میں نے ان دونوں آدمیوں کو ایک طرف کر دیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ گلّو نام کے مزدور کو لے آؤ۔ اُسے ہندو آڑھتی کا نام بھی بتایا۔ بازار دُور نہیں تھا۔ گلّو آ گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ پھولا بادشاہ کہاں ہے۔

"پھولا بادشاہ؟" — اُس نے حیرت کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا — "میں تو اُسے نہیں جانتا۔"

میں نے بڑی زور سے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور کہا — "اب یہ بتاؤ کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا ہے؟ پھولا بادشاہ کل تمہارے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔"

"اوہ — وہ پھولا" — اُس نے کہا — "وہ مجھے کہیں سے سامان اٹھوانے کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں دکان چھوڑ کر نہیں جا سکتا.... بس اتنی سی بات ہوئی تھی۔"

"تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو" — میں نے کہا — "وہ کیا کام کرتا ہے؟"

"وارداتیں کرتا ہے" — اُس نے کہا — "بازی لگاتا ہے"

"تمہاری اُس کے ساتھ یہی دوستی ہے؟" — میں نے کہا اور ویسے ہی ہاتھ اُٹھایا۔

وہ سمجھا کہ میں اُسے ایک اور تھپڑ مارنے لگا ہوں۔ اُس نے دونوں ہاتھ اپنے مُنہ کی طرف اُٹھائے۔ ہاتھوں کی اُلٹی طرف میری طرف تھی۔ مجھے اُس کے دائیں ہاتھ پر لمبے کٹ کا ترچھا نشان نظر آیا۔ میں نے رزّاق کو بلایا اور اُسے گلّو کا ہاتھ دکھایا۔ وہ ہاتھ دیکھنے لگا اور میں گلّو کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلی آئی۔ یہ گھبراہٹ کی تبدیلی تھی۔

"یہی تھا"—— رزّاق نے کہا —— "سولہ آنے یہی تھا"

میں نے رزّاق کو باہر نکال دیا اور گلّو سے کہا کہ وہ برخورداری سے اقبالی ہوجائے ورنہ اُس کی ہڈیاں اُس کے جسم سے نکل کر اُس کے سامنے آجائیں گی اور پھولا بادشاہ کو میں وعدہ معاف گواہ بنالوں گا۔

اُس نے ایک بار پھر ایکٹنگ کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کا جرم سامنے آکر ہی رہے گا پھر میں اُسے پوری سزا دلاؤں گا۔

"تم نے ایک آدمی کو اغوا کیا"—— میں نے کہا —— "اُسے خنجر دکھا کر طلاق لکھوائی۔ اس سے پہلے تم نے اس آدمی کی بیوی کو اغوا کیا اور اس عورت کے ساتھ زیادتی کی۔ میں تمہیں ہر جرم کی الگ سزا دلاؤں گا۔ ٹوٹل بائیس سال بنتا ہے"

"نہ حضور!"—— اُس نے التجا کے لہجے میں کہا —— "میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا نہ کوئی زیادتی کی ہے"

"نہ سہی یار!"—— میں نے دوستانہ لہجے میں کہا —— "تمہاری مرضی .... معلوم ہوتا ہے پہلی بار پکڑے گئے ہو"—— میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا —— "اسے حوالات میں بند کردو"

اُسے بند کر دیا گیا۔ رزّاق کو میں نے گھر بھیج دیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ پھولا بادشاہ ملتا ہے یا نہیں۔ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

## ڈاکو بننا چاہتا تھا

پھولا بادشاہ کو آدھی رات کے وقت لایا گیا۔ میں سویا ہوا تھا۔ صبح



اپنے دفتر میں گیا تو پھولا بادشاہ موجود تھا۔ میں نے رزّاق کو بلوایا اور اُسے پھولا بادشاہ دکھایا۔ شناخت کا یہ طریقہ غلط تھا لیکن لکیر کا فقیر ہوجانے سے مسئلے اُلجھ جاتے ہیں۔ رزّاق نے اُسے پہچان لیا یعنی صرف آنکھیں پہچانیں۔ میں نے پھولا بادشاہ کو ساتھ لیا اور اُسے گلّو دکھایا جو حوالات میں بیٹھا تھا۔ پھولا بادشاہ کو میں اپنے دفتر میں لے آیا۔

"گلّو نے میرے اس وعدے پر اقبال جُرم کیا ہے کہ میں اُسے وعدہ معاف گواہ بناؤں گا"—— میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اُسے کہا —— "اگر تم گلّو سے کچھ زیادہ بتا دو تو وعدہ معافی تمہیں دلا دوں گا۔ اب ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ تمہارا تیسرا ساتھی بھی آرہا ہے"

وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔

"پھولے! تم ان راستوں سے واقف ہو"—— میں نے کہا —— "اناڑی نہیں ہو لیکن اناڑی کو ساتھ لے کر پھنس گئے ہو۔ تمہارے اس یار نے تو ایک منٹ نہیں لگایا۔ میں زور نہیں دوں گا۔ تمہاری مرضی ہے۔ سوچ لو۔ اپنا ریکارڈ دیکھ لو۔ کورٹ میں یہ تمہارے ساتھ جائے گا"

میں نے اُسے الگ بٹھا دیا۔ بہت دیر بعد گلّو کو حوالات سے نکلوا کر اپنے دفتر میں بلایا اور اُسے کہا کہ اب تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم خود ہی بک پڑتے تو فائدے میں رہتے۔ پھولے نے تمہارا راستہ بند کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی سی گنجائش ہے۔ صرف دو منٹ۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے .... میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے اُس کوٹھڑی میں لے چلو اور اس کے سارے کپڑے اُتار دو۔

یہ شخص بدمعاشی میں مُنہ تو مارتا تھا لیکن پولیس کے جال میں پہلی بار آیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھی کو دیکھ لیا تھا کہ آگیا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کا تیسرا ساتھی بھی آرہا ہے تو اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس نے یقین کر لیا کہ پھولے بادشاہ نے اقبال جرم کر لیا ہے۔ اُس نے اپنا بیان اس سوال سے شروع کیا کہ آپ نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا ہے نا؟ میں نے کہا کہ بنا ہی نہیں لیا لکھ بھی لیا ہے۔

گلّو کے بیان کے مطابق ان کا تیسرا ساتھی سیف اللہ عرف سیفی تھا۔

اُسے وہ اپنا اُستاد مانتے تھے۔ گلّو نے سیفی کے گاؤں کا نام بتایا۔ یہ دوسرے تھانے کا گاؤں تھا۔ سیفی کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس کا چوبارہ ہے۔ زمین بھی بہت ہے لیکن وہ اُس قسم کا ڈاکو بننا چاہتا ہے جو اپنا نام پیدا کر گئے ہیں۔ اُس نے چھ سات آدمی اپنے ساتھ ملا لئے تھے۔ گاؤں میں اور اِردگرد اُس کا اثر و رسوخ بھی تھا اور رُعب بھی۔ نمبردار اور ذیلدار کو اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہُوا تھا۔ گلّو اُسی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ چار پانچ مہینے ہوتے اُس کے گروہ میں شامل ہُوا تھا۔

گلّو نے بتایا کہ وہ کس طرح سیفی کے گروہ میں شامل ہُوا اور اُنہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اس سے آپ کو دلچسپی نہیں ہو گی۔ میں آپ کو شمیم کی بات سناتا ہوں۔ گلّو نے مجھے بتایا کہ دو تین روز گزرے سیفی نے اُسے اپنے گاؤں بلایا اور مسلمانوں کے ایک محلے کے ایک گھر کا پتہ بتا کر کہا کہ وہاں سے رات کو رزّاق نام کے ایک آدمی کو اغوا کرنا ہے اور اُسے ایک مکان میں لے جا کر طلاق نامہ لکھوانا ہے۔

گلّو کو یہ تو بتا دیا گیا کہ ایک عورت کی طلاق لکھوانی ہے لیکن اُسے یہ نہ بتایا گیا کہ یہ عورت سیفی کے پاس کس طرح آتی ہے۔ بھولا بادشاہ بھی وہیں تھا۔ سیفی کو بھی ساتھ جانا تھا۔ اغوا کا طریقہ وہی طے ہُوا جس طریقے سے رزّاق کو اغوا کیا گیا تھا۔

دن کے وقت بھولا بادشاہ شہر میں آیا۔ گلّو سے ملا۔ دونوں نے رزّاق کا گھر دیکھا۔ سیفی رات کو آیا تھا۔ اُنہوں نے رزّاق کو بالکل اُسی طرح اغوا کیا جس طرح رزّاق نے مجھے بتایا تھا۔ جس مکان میں رزّاق کو لے گئے تھے وہ گلّو کے ایک دوست کا مکان تھا۔ وہ آڑھت منڈی میں کسی کا منیم تھا۔ اُس کے بیوی بچے وہاں نہیں تھے۔ طلاق نامے کے الفاظ سیفی نے بولے تھے۔ پین گلّو نے دیا تھا۔

طلاق نامہ سیفی لے گیا تھا۔ بھولا بادشاہ سیفی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ گلّو



کو سیفی نے پچاس روپے دیئے تھے۔ اُس زمانے کے پچاس روپے آج کے سات سو روپوں کے برابر ہُوا کرتے تھے۔

گلّو سے اور جو کچھ پوچھنا تھا وہ میں نے پوچھا۔ سیفی کے گھر کا محلِ وقوع بھی معلوم کر لیا۔ اُس نے شمیم کو نہیں دیکھا تھا۔ اُسے سیفی نے اور بھولا بادشاہ نے بتایا ہی نہیں تھا کہ شمیم کو سیفی نے اغوا کیا تھا یا وہ خود سیفی کے ساتھ گئی تھی یا جس طرح طلاق نامہ زبردستی لکھوایا گیا تھا اسی طرح سیفی شمیم کو زبردستی بیوی بنائے گا۔ گلّو کو معلوم نہیں تھا۔

## مجھے شمیم کے پاس لے چلو

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھولا بادشاہ پر ضائع کرتا کہ اُسے اقبالِ جرم کے لئے تیار کرتا اور پھر اقبالی بیان لکھنے بیٹھ جاتا۔ مجھے فوری طور پر سیفی کے گھر چھاپہ مار کر شمیم کو برآمد کرنا تھا۔ بھولے کو میں نے تھانے بلا لیا تھا۔ خطرہ تھا کہ سیفی کو پتہ چل گیا تو وہ شمیم کو کہیں غائب کر دے گا۔

میں نے وقت بچانے کے لئے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ گلّو کو یہ جھانسہ دیتے رکھے کہ وہ وعدہ معاف گواہ ہے اور اُسے گرفتار کر کے اُس منیم کو گرفتار کرے جس کے گھر میں رزّاق کو لے جا کر طلاق لکھوائی گئی تھی۔ پھر دو گواہ ساتھ لے کر اُس مکان کی نشاندہی کراتے اور مکان کو سربمہر کر دے۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کو چھاپے کے لئے تیار کیا۔ چھاپہ رات کو مارنا تھا۔ دس میل کا فاصلہ تھا۔ میں نے اُسی وقت گھوڑا تیار کرایا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو ایک ہی یکے پر بٹھایا اور ہم روانہ ہو گئے۔ پہلے اُس علاقے کے تھانے میں گئے۔ ایک ہندو راجپوت راجیش سنگھ ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ اُس کے ساتھ سیفی کا ذکر ہُوا تو اُس نے بتایا کہ نمبردار اور ذیلدار سیفی کو معزز آدمی ظاہر کرتے رہتے ہیں لیکن راجیش سنگھ کو معلوم تھا

کہ سیفی کس لائن پر جا رہا ہے لیکن ابھی تک اُس کی کوئی واردات پکڑی نہیں گئی تھی۔ سیفی راجیش سنگھ کو شراب اور روپے پیسے سے اپنے ہاتھ میں لینے کے جتن کر رہا تھا۔

"عیش کر پٹھے!" — میں نے اُسے کہا۔

"کر رہا ہوں" — اُس نے کہا — "اُس کا ہر تحفہ قبول کر رہا ہوں لیکن پکڑا گیا تو تمام تحفوں پر لکیر پھیر دوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں .... ایک خیال رکھنا ملک! سیفی کے گاؤں میں جا کر نمبردار سے پہلے نہ ملنا ورنہ وہ سیفی کو خبردار کر کے بھگا دے گا۔ تمہیں سیفی کا گھر معلوم نہیں ہوگا۔ تم نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔ میں تمہیں اپنا آدمی دوں گا۔ وہ تمہیں سیدھا اُس کے گھر تک لے جائے گا اور سیفی کی شناخت بھی کرے گا۔"

تھانے سے سیفی کا گاؤں کوئی دو میل دُور تھا۔ میں سورج غروب ہونے سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تھانے سے چلا۔ راجیش سنگھ نے جو کانسٹیبل گائیڈ کے طور پر دیا تھا وہ مجھے سیفی کے دروازے تک لے گیا۔ پکا دو منزلہ مکان تھا جسے چوبارہ کہا کرتے تھے۔ میں نے اس کے پچھواڑے دو کانسٹیبل بھیج دیئے۔ ایک اور طرف سے یہ مکان کسی اور مکان سے ملا ہُوا نہیں تھا۔ دو کانسٹیبل اُس طرف کھڑے کر دیئے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دروازہ بند ہے۔

دروازہ کھُلا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اُس کے مُنہ پر ماری۔ میرے کانوں میں گائیڈ کانسٹیبل کی آواز پڑی — "یہی ہے" — میں سیفی کو دھکیلتا ہُوا اندر چلا گیا۔ میرے پیچھے ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل آئے۔ سیفی کہہ رہا تھا — "کون ہو، کون ہو، ٹھہرو ٹھہرو۔"

"سیفی!" — میں نے اُسے اپنا نام وغیرہ بتا کر کہا — "شمیم کہاں ہے؟"

"یہاں کوئی شمیم نہیں ہے ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "آپ آرام سے بیٹھیں۔ میرے گھر آپ پہلی بار آئے ہیں۔ کچھ خدمت کا موقع دیں۔"

"سیفی!" — میں نے تحمّل سے کہا — "پہلے اُسے میرے سامنے



لاؤ جس کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں ویسے ہی تو نہیں آ گیا۔ کسی کی نشاندہی پر آیا ہوں۔ تمہارے دونوں ساتھی پکڑے گئے ہیں۔"

"کون سے ساتھی ملک صاحب؟"

میں نے دیکھا کہ وہ چالاک اور ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جب اپنا انداز اختیار کیا جو محض زبانی تھا تو اُس کی زبان بند ہو گئی۔ برآمدگی کے لئے دو گواہوں کی ضرورت تھی۔ میں نے نمبردار کو بلایا۔ وہ آیا تو اُسے کہا کہ دو معزز آدمی ساتھ لے آئے۔ اُن کے آنے تک میں نے سیفی کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ڈیوڑھی سے اندر صحن میں لے گیا۔

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "اس لڑکی کو میں نے اغوا نہیں کیا۔ خاوند نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ میں رات کے وقت ندی کے پُل سے گزر رہا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو پُل پر کھڑے دیکھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ میں گھوڑے پر سوار تھا۔ میں گھوڑے سے اُترا اور ندی میں کُود گیا اور اسے نکال لایا۔ اسے پیٹ کے بل لٹا کر اُوپر سے دبایا تو اس کے پیٹ سے بہت پانی نکلا۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا....

"میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اُس نے مرنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ اس نے بتایا کہ خاوند نے طلاق نامہ لکھ کر میرے ہاتھ میں دیا اور گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا۔ اپنے باپ کا اور اپنے بھائیوں کے بھی نام بتائے۔ میں نے اسے کہا کہ چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں مگر اس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگی کہ میرے گھر میں بھی اب میرے لئے جگہ نہیں رہی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ طلاق نامہ کہاں ہے۔ اس نے اپنی شلوار کے نیفے سے طلاق نامہ نکال کر مجھے دکھایا۔ میں اسے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا کہ اسے اکیلا چھوڑا تو پھر ندی میں کُود جائے گی۔"

میں نے اُسے لڑکتے ہوئے کہا ——" اور جب یہ تمہارے گھر آتی تو تم اسے اتنا زیادہ پسند آ گئے کہ اس نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گی .... بہت اچھا سوچا ہے بے چاری نے۔ کہاں جاتی۔ تم نے بہت بڑی نیکی کی ہے کہ اسے پناہ میں لے لیا ہے .... اب یوں کرو سیفی! مجھے قانون کا مُنہ بند کرنا ہے۔ لڑکی جس کمرے میں ہے۔ مجھے وہاں لے چلو اور طلاق نامہ مجھے دکھا دو، پھر مَوج کرو۔"

## بہت خوبصورت لڑکی تھی

نمبردار دو معززین کے ساتھ آ گیا۔ میں نے سیفی سے کہا کہ چلو بھائی! وہ لڑکی مجھے دکھا دو۔ میں نے کچھ اور میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری باتیں کیں اور وہ اُلّو کا پٹھا بن کر ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ شمیم بڑے خوبصورت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ تھانیدار کو دیکھ کر گھبراتی ہوئی اُٹھی۔ سیفی نے کہا —— "یہ ہے شمیم" —— میں نے نمبردار اور دو معززین سے کہا کہ تم نے دیکھا کہ اس (سیفی) کی نشاندہی پر یہ لڑکی ہمارے سامنے آتی ہے۔

"اس کا طلاق نامہ بھی دکھا دو" —— میں نے سیفی سے کہا۔

وہ دوسرے کمرے میں گیا اور تہہ کیا ہوا ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔ وہی تحریر تھی جو رزاق نے مجھے بتائی تھی۔ میں نے یہ کاغذ نمبردار اور دوسرے دو گواہوں کو دکھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس طرح جو اشیاء برآمد ہوتی ہیں ان کی کاغذی کارروائی کرنی ہوتی ہے۔ گواہوں کے انگوٹھے لگوائے جاتے ہیں اور اس کا ایک طریقۂ کار ہوتا ہے۔

میں نے سیفی کے سارے گھر کی تلاشی لی۔ ایک دو نالی بندوق لائسنس والی، ایک ریوالور بغیر لائسنس اور چھ خنجر جن کی لمبائی غیر قانونی تھی برآمد ہوئے۔ ان کے بھی کاغذات تیار کئے اور جب میں سیفی کو ہتھکڑی لگانے لگا تو اُس نے ناچنا اور بدکنا شروع کر دیا۔ نمبردار اور ذیلدار نے اُس کی سفارش



کی اور کہا کہ سیفی عزّت دار آدمی ہے۔ اسے ہتھکڑی نہ لگائیں۔ میں نے آنکھیں دکھائیں تو وہ دبک گئے۔ سیفی نے رشوت پیش کی جو میں نے ہنس کر ٹھکرا دی۔

اُس نے آخر شمیم سے کہا کہ وہ مجھے بتاتے کہ وہ سیفی کے پاس کس طرح پہنچی ہے۔ شمیم نے وہی بیان دیا جو سیفی نے دیا تھا۔ اُس نے بھی کہا کہ اُس نے طلاق نامہ سیفی کو دے دیا تھا۔

"اس نے میرے ساتھ زبردستی نہیں کی" —— شمیم نے کہا —— "میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کر رہی ہوں۔ خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے"

"میں اسے سزا دلانے تو نہیں لے جا رہا۔ تمہیں سزا ملے گی" —— میں نے کہا —— "مجھے اپنی کارروائی مکمل کرنی ہے۔ تمہیں بھی تھانے چلنا پڑے گا"

مختصر یہ کہ انہیں تھانے لانا تھا، میں تھانے لے آیا۔ رزاق کو بلایا۔ اس نے شمیم کو دیکھ کر تصدیق کی کہ یہی اُس کی بیوی ہے۔ میں نے سب سے پہلے شمیم کو اپنے سامنے بٹھایا۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔

"میری بات غور سے سُننا شمیم!" —— میں نے اُسے کہا —— "تم نے جُرم کیا ہے۔ اپنے خاوند کو چھوڑ کر بھاگی ہو۔ اس نے تمہیں طلاق نہیں دی تھی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ رزاق سے طلاق کس طرح لکھوائی گئی ہے۔ تم بھی اس جُرم میں شریک ہو۔ تمہارا یہ بیان بالکل جھوٹ ہے کہ تم خودکشی کے لئے ندی میں کُود گئی تھیں"

"میرے ہاتھ میں قرآن دے دو" —— اُس نے تڑپ کر کہا —— "سیفی نے مجھے ندی میں سے نکالا تھا"

"میں مان لیتا ہوں" —— میں نے کہا —— "لیکن طلاق نامہ ندی میں سے نہیں نکلا۔ یہ طلاق نامہ تمہارے پاس تھا .... ہاں .... اسے تم نے کہاں رکھا ہوا تھا؟"

"شلوار کے نیفے میں"

میں نے طلاق نامہ اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا ــــ "یہ ذرا سا بھی نہیں بھیگا۔ کیا اسے تعویذ کی طرح چاندی یا سونے کے خول میں تم نے رکھا ہُوا تھا؟"

وہ کچھ نہ بولی۔

"اس طلاق نامے پر جو تاریخ ہے تم اس سے پانچ چھ روز پہلے گھر سے بھاگی تھیں" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے اور سیفی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ خاوند نے طلاق نامہ تمہارے ہاتھ دیا اور گھر سے نکال دیا۔ پھر اُس نے طلاق نامے پر چھ روز آگے کی تاریخ کیوں لکھی؟ ..... ہو سکتا ہے اُس نے غلطی سے تاریخ آگے کی لکھ دی ہے تو مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کاغذ ندی میں بھیگا کیوں نہیں؟"

اب وہ صرف سر ہلاتی اور دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتی تھی۔

"سیفی کچا چور ہے شمیم!" ــــ میں نے کہا ــــ "مجھے صحیح بات بتا دو پھر میں دیکھوں گا کہ تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم مظلوم لڑکی ہو مجھے تمہارے تمام حالات معلوم ہیں۔"

میں نے اُس کے ساتھ مشفقانہ اور جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ وہ کم عمر لڑکی تھی۔ ستائی ہوئی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ کچھ دیر بعد اُس نے صحیح بیان دے دیا۔

## ندی میں کُود گئی

اُس کا بیان بہت ہی لمبا تھا۔ میں اُس کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ اُس کے ہر اقدام اور ہر بات کی تعریف کرتا رہا۔ کچھ پوچھتا بھی رہا۔

اس طرح اُس کا بیان صبح طلوع ہو گئی تو ختم ہُوا۔ اُس کے باپ نے اُس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا وہ اُس نے تفصیل سے سُنایا۔ یہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ اُس کی شادی ہوئی تو ایسا ہی سلوک خاوند نے شروع کر دیا۔ ساس کی



زمین روز کارروائیاں الگ تھیں۔

"باپ جب میرے چال چلن پر شک کرتا تھا تو دل میں آتی تھی کہ اس کے شک کو صحیح کر دکھاؤں" ــــ شمیم نے کہا ــــ "باپ کو مجھ پہ اعتبار نہیں تھا لیکن اپنی عزت مجھے جان سے زیادہ پیاری تھی۔ ان لوگوں نے میرا صبر آزمایا۔ میں نے اپنی خوشیاں اور ہنسی مذاق قربان کر دیا۔"

آخر وہ رات آئی جب وہ گھر سے نکلی۔ ساس کا رویہ ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ خاوند تو جیسے اُس کا خاوند رہا ہی نہیں تھا۔ اُس نے اُسے کئی بار مارا پیٹا بھی تھا۔ اُس روز خاوند نے اُسے کچھ ایسی سخت باتیں کہہ دیں جو وہ برداشت نہ کر سکی۔ اُس نے ساس کو بہت بُری سنائیں اُسے معلوم تھا کہ خاوند کو اُسی نے بھڑکایا ہے۔ اُس نے ساس کو گالی گلوچ کی تو خاوند نے اُسے دو چار تھپڑ جڑ دیئے۔ وہ اپنے گھر گئی اور شکایت کی۔ باپ نے کہا کہ تیرے جو کرتوت یہاں تھے وہی وہاں ہیں۔

شمیم جلی بھُنی واپس آگئی۔ رات اُسے نیند نہ آئی۔ آدھی رات سے پہلے اُس نے دیکھا کہ اُس کی ساس، اُس کا خاوند اور خاوند کے بھائی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اُٹھی اور دبے پاؤں باہر والے دروازے تک گئی۔ زنجیر کھولی اور باہر نکل گئی۔ اُس کے بیان کے مطابق، اُس کا دماغ اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ کوئی اور ہی طاقت تھی جو اُسے ندی کی طرف لے جا رہی تھی۔

وہ ندی دراصل چھوٹا دریا تھا۔ اُن دنوں پانی زیادہ تھا۔ قصبے کے قریب ندی دو بلند اور چٹانی کناروں میں سے گزرتی اور مُڑتی تھی۔ وہاں پاٹ تنگ تھا اس لئے پانی گہرا تھا۔ اسی موڑ پر لکڑی کا پُل تھا۔ شمیم پُل پر جا پہنچی۔ چاندنی صاف تھی۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ ندی کے شور نے اور موت نے اُسے ڈرا دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کُودے یا نہ کُودے۔

پُل پر ایک گھوڑا آیا جس پر ایک سوار تھا۔ شمیم کو یہ خطرہ محسوس ہُوا کہ یہ سوار اُسے پکڑ لے گا اور گھوڑے پر ڈال کر جانے کہاں لے جائے۔ اُس

کی نجات کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہ پُل کے جنگلے پر چڑھی۔ سوار بالکل قریب آ گیا۔ شمیم ندی میں کُود گئی۔ اُس کا مُنہ کُھلا ہُوا تھا۔ پانی اُس کے مُنہ میں چلا گیا۔ فوراً ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آئی تو وہ پیٹ کے بَل زمین پر پڑی تھی اور ایک آدمی اُس کے پہلوؤں اور پیٹھ کو دبا رہا تھا۔ وہ سمجھی کہ اُس نے ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ اُسے قے آئی اور پیٹ سے پانی نکلا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے چاندنی میں اپنے قریب گھوڑا کھڑا دیکھا پھر اُس نے اس آدمی کو دیکھا۔ یہ سیفی تھا۔ شمیم نے روتے ہوئے کہا —"تم نے مجھے پانی سے نکالا ہے؟"

"دل مضبوط کرو"— سیفی نے اُسے کہا —"ڈرو نہیں۔ جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔ اچھی طرح ہوش میں آ جاؤ"— اور سیفی نے اُسے بہت سی تسلیاں دیں۔ ہمدردی کی۔

شمیم پوری طرح اپنے آپ میں آگئی تو سیفی کے پوچھنے پر اُس نے اپنے باپ اور اپنے خاوند کا نام بتایا۔ سیفی نے اُسے کہا کہ وہ اُسے اُس کے گھر چھوڑ آتا ہے۔ شمیم نے اُسے کہا کہ مجھے ندی میں پھینک دو۔ مجھے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ سیفی کو اُس نے اپنے دُکھ کی داستان سنا ڈالی۔ سیفی نے اُسے کہا کہ وہ مرد ہے اور ایک جوان لڑکی کو اِس حال میں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

"تم مجھ پر اعتبار کرو نہ کرو، میں اپنا فرض پورا کروں گا"— سیفی نے کہا —"اپنے گھر نہیں جاؤ گی تو میں تمہیں زبردستی اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

شمیم بہت تڑپی۔ اُس نے کہا کہ گھر چلی گئی تو خاوند اسے اُسی وقت طلاق دے دے گا اور باپ الگ جُوتے مارے گا۔ سیفی نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے طبیعت سنبھل جاتے تو جیسا وہ کہے گی ویسا ہی ہوگا۔ اس کی عزت محفوظ رہے گی۔ بڑی مشکل سے سیفی نے اُسے اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا۔ اُسے گھوڑے پر بٹھا کر خود پیدل چلا۔ سیفی کا گاؤں گیارہ بارہ میل دُور تھا۔ راستے میں وہ باتیں کرتے رہے۔ شمیم نے محسوس کیا کہ یہ آدمی تو فرشتہ ہے۔



# وہ پیار کا پیاسا تھا

یہ فرشتہ اُسے اپنے گاؤں میں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں شمیم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ یہ تو کوئی خُوبرو جوان ہے۔ گھر میں ایک بوڑھی عورت تھی اور ایک آدمی۔ بڑھیا نوکرانی تھی اور آدمی نوکر تھا۔ شمیم کو سیفی نے اپنے کپڑے دیئے۔ بڑھیا اُس کے لئے دُودھ گرم کر لائی۔ کھا پی کر شمیم بے ہوشی کی نیند سو گئی۔

اُس کی آنکھ کُھلی تو سورج نکل آیا تھا۔ اس کے ساتھ کسی نے چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ وہ باہر نکلی تو سیفی صحن میں بیٹھا تھا۔ اُس نے نوکرانی کو آواز دی اور اُسے کہا کہ کھانے پینے کے لئے کچھ لاؤ۔

پہلے دن ہی شمیم کے دل سے آواز اُٹھی کہ اس کی پناہ یہی ہے۔ سیفی نے اسے پہلے دن ہی بتا دیا کہ وہ کیا ہے۔ اُس کی خاصی زمین تھی، جو بارہ تھا مگر محبّت اور پیار نہیں تھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ اُس کی عمر تیس سال ہو چکی تھی۔ ماں باپ لڑکپن میں مر گئے۔ چچے تائے زمین کی خاطر دشمن ہو گئے۔ وہ ماں باپ کا اکیلا بیٹا تھا۔ کچھ زمین چچے تائے دبا گئے۔ اُس کی کسی نے نہ سُنی۔ جب جوان ہُوا تو سب کے مقابلے پر اُتر آیا۔ غنڈہ اور بدمعاش بن گیا۔ بدمعاشوں کے ساتھ دوستانہ ہو گیا۔ پولیس کے ساتھ بھی دوستی ہو گئی۔ اُس کے حصّے میں خاصی زمین آئی۔ یہ جو بارہ بھی تھا

پہلے اُسے ہر کوئی دھتکارتا تھا۔ اب وہ جوان ہو گیا اور زمین اور جو بارہ اُس کے نام پکّا ہو گیا تو بعض گھرانے اُسے اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کرنے لگے۔ اُس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر کہا کہ تم لوگ اپنی بیٹیاں مجھے نہیں میری جائیداد کو دے رہے ہو اور اس لئے بھی کہ میں اکیلا ہوں

اس ضد میں آکر اُس نے شادی نہ کی لیکن وہ پیار کے لئے ترس رہا تھا۔ اُس نے شمیم سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ زبردستی نہیں کرے گا۔

اگر اس کا دل مانے تو اُس کی بیوی بن جائے۔ شمیم نے کہا کہ طلاق لئے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ سیفی نے سوچ کر کہا کہ طلاق لے لی جائے گی۔

تیسرے روز سیفی نے شمیم کو ایک کاغذ دکھا کر کہا کہ یہ لو طلاق آ گئی ہے۔ شمیم کو یقین نہ آیا۔ سیفی نے اُسے بتا دیا کہ طلاق کس طرح لکھوائی گئی ہے۔ سیفی نے اُسے کہا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر پکڑے گئے تو تم یہ بیان دینا کہ خاوند نے مجھے طلاق نامہ دے کر رات کے وقت گھر سے نکال دیا تھا اور میں خودکشی کے لئے ندی میں کُود گئی مگر سیفی جو اتفاق سے ادھر آ رہا تھا میرے پیچھے ندی میں کُود آیا اور مجھے مرنے سے بچا لیا پھر میں نے اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔

میں نے بڑے پیار سے جرح شروع کی تو شمیم نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ طلاق لکھوانے کی سکیم میں وہ بھی شامل تھی۔ سیفی اور بھولا بادشاہ نے اُس کے پاس بیٹھ کر سکیم بنائی تھی اور شمیم نے انہیں اپنے گھر کے اندر کا نقشہ سمجھایا تھا تاکہ اندر جانے کی ضرورت پڑے تو یہ بھٹک نہ جائیں۔ سیفی نے شمیم سے کہا تھا کہ جب یہ معاملہ خیریت سے طے ہو جائے گا تو رزاق کے گھر ڈاکہ ڈالا جائے گا۔ شمیم نے کہا کہ رزاق کو قتل کر دیا جائے تو اُسے روحانی خوشی ہو گی۔ وہ گلّو کو نہیں جانتی تھی۔

سیفی اور شمیم کا ابھی نکاح نہیں پڑھا گیا تھا لیکن یہ رسمی کارروائی تھی جس کی اُنہوں نے پابندی ضروری نہ سمجھی۔ شمیم نے اُسے اپنا خاوند بنا لیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ سیفی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔

"اگر کہا گیا کہ یہ طلاق نہیں ہوتی تو بھی میں رزاق کے ساتھ نہیں رہوں گی"— اُس نے کہا — "اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں رزاق کو زہر دے دوں گی۔"

میں نے اُسے کہا کہ سیفی اچھی شہرت کا آدمی نہیں۔ سُنا ہے کہ اُس نے ڈاکوؤں کا گروہ بنا رکھا ہے۔

"میرے ماں باپ، میری ساس اور میرے خاوند جیسے عزت دار دل



سے تو یہ ڈاکو اچھا ہے جس نے مجھے انسان سمجھا اور میرے درد کو اپنے سینے میں ڈال لیا ہے"— اُس نے کہا — "اسے بھی پیار نہیں ملا۔ اُس کے چچے تائے اس کی اتنی ساری زمین مار گئے لیکن انہیں کوئی ڈاکو نہیں کہتا .... مجھے نفرت ملی ہے۔ میں محبت کی ترسی ہوئی ہوں۔"

مجھے ایک ماہر نفسیات کے الفاظ یاد آتے — "کسی بچے کو اور کسی عورت کو صرف پھٹکار اور طعنے ملتے رہیں تو اس بچے یا عورت کو کسی بھدے، بدصورت اور وحشی آدمی سے ذرا سا پیار مل جائے تو وہ اُس کے ساتھ چل پڑیں گے۔"

میں نے شمیم پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ پہلے تو اسے جیل میں دو تین سال گزارنے پڑیں گے۔ اس کے بعد اسے سوچنا ہو گا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ غور کریں کہ یہ کتنی بڑی خرابی ہے کہ جو لوگ اور حالات ایک انسان کو مجرم بناتے ہیں ان کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، سزا صرف مجرم کو ملتی ہے۔

## بدمعاش بن کر دکھا دیا

سیفی نے مجھے ایک بار پھر چکر دینے کی کوشش کی۔ شمیم کو میں الگ ہٹا چکا تھا۔

"سیفی یار!" — میں نے دوستی دوستی کے لہجے میں کہا — "تم جس قسم کے ڈاکو اور رہزن بننا چاہتے ہو ویسے ہی بنو اور ضرور بنو لیکن پہلے کسی اُستاد کی شاگردی کر لو۔ کسی تھانیدار سے دو چار باتیں پوچھ لو۔ تم تو بالکل اناڑی ہو یار!" — میں نے طلاق نامہ اُسے دکھا کر کہا — "یہ کاغذ مومی تو نہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ کاغذ ندی سے نکلا تھا۔ شمیم کے نیفے میں تھا مگر ذرا سا بھی نہیں بھیگا .... طلاق نامہ لکھوا کر یہ ثابت کرنا تھا کہ شمیم کے خاوند نے لکھا اور شمیم کو دیا تھا تو اس پہ تاریخ وہ لکھواتے جس تاریخ کو شمیم گھر سے بھاگی اور ندی میں کُودی تھی۔ بھولا بادشاہ تو اناڑی نہیں لگتا۔ دو سزائیں کاٹ چکا ہے۔ ایک

میں اُستادی سے بری ہو چکا ہے۔ کئی واردا تیں صاف ہضم کر گیا ہے۔ اُسے بھی تاریخ کا خیال نہ آیا۔"

"اب آپ ہی بتائیں نا، کیا کریں"— اُس نے کہا یوں جیسے یہ کوئی معمولی سی اُلجھن تھی۔

"کرنا کیا ہے"— میں نے کہا— "مجھے تمہارے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ شمیم بیان دے چکی ہے۔ بھولا بادشاہ اور گلو بیان دے کر حوالات میں بیٹھے ہیں۔ تم بیان دو نہ دو۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

مجھے دراصل اُس کے بیان کی ضرورت تھی۔ اُس کے لئے میں بے نیازی اور بے رُخی کا طریقہ اختیار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے پھر رشوت کی پیشکش کی۔ میں نہ مانا تو اُس نے کہا کہ شمیم کو دو چار دنوں کے لئے اپنے پاس رکھ لیں۔

"وہ تو کئی دن میرے تھانے کی مہمان رہے گی"— میں نے کہا— "تم اور تمہارے یہ دوست، سب میرے مہمان ہیں .... تمہارے پاس کوئی ایسی شہادت یا کوئی ایسا بیان ہے جو تمہیں بچالے؟"

"نہ جی، کچھ بھی نہیں۔"

"بولو، یہ سب کیسے ہُوا؟"— میں نے کہا— "تمہارے پاس زمین ہے، چوبارہ ہے، تمہاری ذات اُونچی ہے۔ تمہارا حکم اور رعب چلتا ہے پھر تم کس لائن پر چڑھ گئے ہو؟"

اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ اُس نے بات یہاں سے شروع کی اور بڑے جوش سے کی— "میں لٹیرا ہوں گا ملک صاحب! مجھے کسی کی دولت اور کسی کی جائیداد نہیں چاہئے۔ میں ان لوگوں کے گھر خالی کر دوں گا اور مال اِدھر اُدھر پھینک دوں گا۔ آپ مجھے سزا دلا دیں۔ سُنا ہے جیل خانے میں اُستاد مل جاتے ہیں۔ اُن سے سبق لے کر آؤں گا۔ آپ مجھے پھانسی تو نہیں دلا سکتے۔ اُوپر خدا کی ذات بھی ہے۔ میں نے ایک عورت کو مرنے سے بچایا ہے کسی کی جان لی نہیں۔ اگر شمیم کا کہنا سچ ہے کہ وہ خاوند سے تنگ تھی تو میں نے زبردستی طلاق لکھوا کر نیکی کی ہے۔ آپ اسے جرم کہہ لیں مجھے محبت کی ضرورت تھی۔ وہ



شمیم نے مجھے دی۔ اُسے پیار کی ضرورت تھی۔ وہ میں نے اُسے دیا۔ آپ تھانیدار ہیں ملک صاحب! آپ کے سینے میں جو دل ہے وہ پتھر بن گیا ہے۔ مجھے قید کی سزا دلا کر آپ بہت سے تھانیداروں کو مصیبت میں ڈال دیں گے۔ وہ سیفی ڈاکو کو ڈھونڈتے پھریں گے اور میری گولیوں سے مریں گے۔"

"سیفی یار!"— میں نے کہا— "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں قید میں بھیجنے کی بجائے حج کے لئے بھیج دیتا لیکن مجبور ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ یہ شخص ذہنی لحاظ سے نارمل نہیں تھا۔ ایسے لوگ نارمل ہو ہی نہیں سکتے۔ سیفی کو میں نے دل کا غبار نکالنے کا پورا موقعہ دیا اور سلوک دوستانہ رکھا۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے طلاق اُسی طرح لکھوائی تھی جس طرح رزاق اور گلو نے مجھے بتایا تھا۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار کہیں سے اپنے گاؤں کو جا رہا تھا۔ پُل پر آیا تو چاندنی میں اُسے ایک عورت نظر آئی۔ وہ پُل کے جنگلے پر چڑھ گئی۔ سیفی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ عورت کے اتنے قریب پہنچ گیا تھا کہ ہاتھ لمبا کر کے اُسے پکڑ سکتا تھا مگر اُس نے حماقت کی کہ گھوڑے سے اُترا۔ اتنے میں عورت ندی میں کُود گئی۔

"وہ اپنی جان لینے کے لئے ہی کُودی ہو گی"— سیفی نے مجھے بتایا— "آدھی رات کو وہ ندی میں نہانے تو نہیں آئی تھی۔ وہ جل پری بھی نہیں تھی۔ اُس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مجھے بجلی چمکنے کی طرح خیال آیا کہ یہ کوئی میری طرح دُکھی ہے۔ شوق سے کون مرتا ہے۔ مرد اگر ستایا ہُوا ہو تو کسی نہ کسی طرح بدلہ لے لیتا ہے۔ عورت بے چاری جان لینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اُس کے پیچھے کُود گیا۔ وہ ڈوب گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چاندنی تھی۔ میں نے اُسے دیکھ لیا تھا کہاں ہے۔"

سیفی شمیم کو نکال لایا۔ اُس کے پیٹ سے پانی نکالا۔ وہ ہوش میں آگئی اور اُن کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ آپ شمیم کی زبانی سُن چکے ہیں۔ گھر لا کر سیفی نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ یہ تو بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی ہے۔

"میرا خدا گواہ ہے کہ میری نیّت میں فتور نہیں آیا"— سیفی نے کہا—

”مرے ہوئے کو مارنا مردانگی نہیں۔ دوسرے دن اُس لڑکی نے جب مجھے اپنی رام کہانی سنائی تو میرا دل پگھل گیا۔ شاید میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ سنا چکی تو میں نے اسے اپنی سنائی .... ملک صاحب! میری عمر تیرہ سال تھی جب پہلے باپ مرا پھر کچھ مہینوں بعد ماں بھی مر گئی۔ میں کیسے بتاؤں آپ کو میرا کیا حال ہُوا۔ مجھے ایک چچا اپنے گھر لے گیا۔ میں اپنے ماں باپ کو ڈھونڈتا اور روتا تھا۔ چچی نے مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر دوسرا چچا اپنے گھر لے گیا۔ وہاں بھی میرے ساتھ یہی سلوک ہُوا۔ تایا بھی ایسا ہی نکلا ....

”مجھے جو بھی اپنے گھر رکھتا تھا وہ میرے بہانے میرے گھر کا کچھ سامان اٹھا کر اپنے گھر لے جاتا تھا۔ میری ماں کا زیور بھی وہ لوگ اُڑا لے گئے۔ اُنہوں نے ٹرنک خالی کر دیئے۔ مل ملا کر انہوں نے کتنی ہی زمین مار لی اور میں جب جوان ہُوا تو میرے دشمن ہو گئے۔ میں نے زمین سے اپنا حصّہ مانگا تو اُنہوں نے مجھے دھتکارنا شروع کر دیا۔ تایا نے مشہور کر دیا کہ سیفی بدمعاش ہے۔ اسے زمین مل گئی تو بیچ کھائے گا۔ میں نے بدمعاشوں کی طرح ان سے اپنا حصّہ مانگا اور مجھے اپنے حصّے سے آدھا ملا۔ اس کے بعد میں نے انہیں بدمعاش بن کر دکھا دیا۔“

سیفی نے کہا کہ اُس نے اپنے سگوں سے کہا کہ اس کی ساری جائیداد لے لیں اور اُسے وہ پیار دیں جو اس کے ماں باپ قبروں میں لے گئے ہیں مگر ان کے گھروں سے وہ دھتکارا گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تین چار عورتوں سے اُسے پیار ملا لیکن دھوکہ تھا۔ وہ سیفی کا گھر خالی کرنے کے لئے اُسے پیار دیتی تھیں۔ وہ اُس سے کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی تھیں۔ اُس نے ان سے نجات حاصل کر لی اور بھٹکنے لگا۔ پھر اُس نے شراب سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ شراب ہر بدی کی جڑ ہے۔ وہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ شادی سے اُسے چڑ ہو گئی۔ اُسے رشتے ملتے تھے تو صاف کہتا تھا کہ تم لوگ میری جائیداد کو بیٹی دے رہے ہو۔ جب میں کہتا تھا کہ مجھے بیٹا بنا کر سینے سے لگا لو تو تم مجھے دھتکارتے تھے۔

آخر اُسے شمیم مل گئی۔ شمیم کو پناہ اور پیار کی ضرورت تھی۔ سیفی نے اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ اسی کی ہو کے رہ گئی لیکن دونوں جیل



میں جا رہے تھے۔ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جب کیس تیار کر لیا تو ان دونوں سے کہا کہ وہ عدالت میں اتنا جذباتی بیان دیں کہ جو سُنے اُس کے آنسو نکل آئیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ عدالت میں فردِ جرم قبول کر لیں۔ میں نے انہیں بیان یاد کرا دیئے۔ یہ بڑے ہی جذباتی بیان تھے۔

قانون ایک لکیر پر چلتا ہے۔ اسے جذبات اِدھر اُدھر نہیں کر سکتے لیکن مجسٹریٹ اور جج انسان ہوتے ہیں۔ وہ قانون کے خلاف تو نہیں چل سکتے۔ البتہ سزائیں ذرا نرمی برت جاتے ہیں۔ اس کیس میں بھی ایسے ہی ہُوا۔ مجسٹریٹ نے سیفی اور شمیم کو ایک ایک سال اور پھولا بادشاہ اور گلّو کو نَو نَو ماہ سزائے قید دی۔ سب کو کچھ جرمانہ بھی کیا گیا جو سیفی نے ادا کر دیا۔ سیفی کو مختلف الزامات میں جو سزائیں دی گئی تھیں، ان کی میعاد ساڑھے تین سال تھی لیکن فیصلے میں لکھا گیا کہ سزائیں اکٹھی شروع ہوں گی۔ اس طرح قید ایک سال بنتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ سیفی جیل سے نکل کر ڈاکو بن جائے گا اور شمیم کی زندگی تباہ ہو گی لیکن ساڑھے چار سال بعد اتفاق سے اس علاقے کا ایک اے۔ ایس۔ آئی ملا۔ میں اس وقت دِلّی عارضی ڈیوٹی پر آیا ہُوا تھا۔ مجھے سیفی اور شمیم یاد آئے۔ میں نے اُن کے متعلق پوچھا تو اے۔ ایس۔ آئی نے بتایا کہ سیفی ایک معزّز آدمی ہے۔ شمیم نے اسے بدمعاشی سے ہٹا لیا تھا۔

# خُدا کا مرید

تھانہ نیا تھا۔ میں ابھی اس علاقے میں اجنبی تھا اور تھانے کے عملے سے بھی پوری طرح واقفیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں ایک ہی مہینہ ہوا تھا۔ جانے والے ایس۔ ایچ۔ او نے مجھے علاقے اور قصبے کے چیدہ چیدہ افراد کے متعلق پوری معلومات دے دی تھیں۔ ان میں سرکردہ، معزز اور رئیس افراد بھی تھے۔ عادی مجرم، سزا یافتہ، سرکاری اور غیر سرکاری مخبر وغیرہ بھی تھے، لیکن زبانی راتے اور معلومات کو میں کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے وقتاً فوقتاً ملنا اور اپنی راتے قائم کرنی تھی۔

عملے میں ایک اے۔ ایس۔ آئی نادر خان دِلّی کے قریب کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے متعلق جانے والے تھانیدار نے مجھے بتایا کہ بہت دلیر اور ذہین آدمی ہے۔ غلطی کرتا ہے تو بھی جرأت اور ذہانت سے کرتا ہے اور جب اپنا فرض پورا کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو انگریز افسروں کو بھی لتاڑ دیتا ہے۔ خطرے مول لینے والا آدمی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اسے لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سرکش بھی ہو جاتا ہے۔

نے حمید کو حوالات سے نکلوایا۔ میں برآمدے میں بیٹھا تھا اور اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے اُسے ہتھکڑی لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ اچھا خوبرو جوان تھا۔ جسم توانا اور پھرتیلا لگتا تھا۔ اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے بہت اذیتیں دی گئی ہیں۔ نادر خان میرے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے اسے اُٹھا دیا۔



"دیکھو حمید!" — میں نے اسے کہا — "میں آ گیا ہوں۔ اب تمہارے جسم کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ میں یاروں کا یار ہوں۔ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ تم نے جسے قتل کیا ہے وہ میرا کچھ نہیں لگتا تھا۔"

میں بات کر رہا تھا تو وہ اُٹھا۔ میں نے اُسے بیٹھے رہنے کو کہا تو اُس نے کہا — "ذرا جسم سیدھا کر لوں۔ ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے" — اُس نے انگڑائی لی۔ جسم سیدھا کیا اور بیٹھ گیا۔

"تم اگر اقبالِ جُرم نہ کرو تو بھی تمہارے خلاف شہادت مکمل ہے" — میں نے کہا — "تم بیان دے دو کہ تم نے اُسے کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔"

"قتل کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی" — اُس نے کہا — "نہ میں نے قتل کیا ہے۔"

میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور بڑے پیارے انداز سے اُسے سمجھانے لگا۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی ایک ٹانگ لمبی کی اور اسے اکٹھا کر لیا پھر دوسری ٹانگ لمبی کر کے اکٹھی کر لی۔

مجھے سرکش، دلیر اور ذہین اسسٹنٹ کی ہی ضرورت تھی مگر میں سمجھ نہ سکا کہ نادر خان کی سرکشی اور ذہانت اچھے اور جائز کاموں میں استعمال ہوتی تھی یا غیر قانونی حرکتوں میں بھی۔ بہرحال میں نادر خان کو خوش طبع اور اپنے کام کا آدمی سمجھتا تھا۔ میں نے اُس میں خاص قسم کی خود اعتمادی دیکھی تھی جس کا پولیس آفیسر میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ مجھے ابھی دیکھنا تھا کہ میرے اس نئے تھانے کے سٹاف میں کون کتنے پانی میں ہے۔

ابھی میں علاقے، تھانے کے سٹاف اور علاقے کے لوگوں سے متعارف ہو ہی رہا تھا کہ میرے گھر سے تار آ گیا کہ فوراً پہنچو۔ زمین جائیداد کا کچھ تنازعہ قریبی رشتہ داروں سے چل رہا تھا۔ اس کے فیصلے کی صورت پیدا ہو گئی تھی جس کے لئے میری موجودگی لازمی تھی۔ میں نے پندرہ دِنوں کی

چھٹی لے لی اور تھانہ اے۔ ایس۔ آئی نادر خان کے حوالے کر کے چلا گیا واپس آیا تو پتہ چلا کہ دو روز پہلے تھانے کے دیہاتی علاقے میں ایک آدمی قتل ہو گیا تھا اور قاتل کو پکڑ لیا گیا ہے۔ اس کے خلاف نادر خان نے شہادتیں اکٹھی کر لی تھیں لیکن ملزم اقبال جرم نہیں کر رہا تھا۔ شہادتیں تو مل گئی تھیں لیکن اقبال جرم کی پھر بھی ضرورت تھی تاکہ مقدمے میں کوئی خانہ خالی رہ جائے تو پورا کیا جا سکے۔ نادر خان نے اقبالی بیان لینے کے لئے وہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا جو پولیس والے کیا کرتے ہیں، یعنی ایذا رسانی۔ میں اس کے خلاف تھا۔ میں نے نادر خان کو روک دیا اور اسے کہا کہ میں اس ملزم کے ساتھ بات کروں گا۔

قتل کی اور قاتل کی گرفتاری کی کہانی اس طرح تھی کہ قصبے سے تقریباً ڈیڑھ میل دور ایک گاؤں تھا۔ وہاں مخدوم علی نام کا ایک زمیندار رہتا تھا۔ اس کا ایک نوکر جس کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ تھی، دن کے پچھلے پہر کھیتوں میں کہیں کام کر رہا تھا۔ زمیندار مخدوم علی کا ایک جوان بیٹا کھیتوں میں تھا۔ ان کی زمینداری خاصی وسیع تھی۔ ان کے کچھ مزارعے اور ملازم بھی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ مخدوم علی کے بیٹے نے شور مچایا۔

"اِدھر آؤ اوئے سارے .... وہ دیکھو اسے مار گیا ہے۔ دوڑو، پکڑو۔"

مزارعے دوڑے گئے۔ آگے کھیت ختم ہو جاتے تھے اور زمین ذرا گہرائی میں ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ ان کا ایک ساتھی جو مخدوم علی کے مویشیوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا، زمین پر پڑا ہے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پچیس تیس گز دور اُن کے گاؤں کا ایک آدمی، حمید کھڑا تھا۔ مخدوم علی کا بیٹا حمید کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا کہ اسے پکڑو۔ مزارعے اُسے پکڑنے کو دوڑے تو وہ بھاگ اُٹھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ وہ تندرست اور پھرتیلا تھا۔ وہ اتنی تیز دوڑا کہ کھڈ نالوں میں جا کر غائب ہو گیا۔

تھانے میں رپورٹ آئی۔ نادر خان موقعۂ واردات پر گیا۔ لاش دیکھی۔



زمیندار مخدوم علی کا بیٹا عینی شاہد تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اُدھر گیا تو حمید مقتول کو گھونسوں سے مار پیٹ رہا تھا۔ مقتول کمزور تھا۔ وہ گر پڑا۔ حمید نے قریب پڑا ہُوا ایک پتھر اُٹھایا جس کا وزن کم و بیش دو سیر تھا۔ اُس نے یہ پتھر مقتول کے سر پہ مارا۔ اُس نے پھر پتھر اُٹھایا اور پھر اس کے سر پہ مارا۔ مقتول تڑپ رہا تھا۔ حمید نے ایک بار پھر اُس کے سر پہ پتھر مارا۔ مخدوم علی کا بیٹا اُس کی طرف دوڑا تو حمید دوڑ کر پرے چلا گیا۔ بیس پچیس قدم دُور جا کر وہ رُکا اور مخدوم علی کے بیٹے کو دھمکی دی کہ اُس نے کسی کو بتایا تو وہ اُسے بھی قتل کر دے گا۔ مخدوم علی کے بیٹے نے اپنے مزارعوں کو آوازیں دیں۔ حمید نے اتنے زیادہ آدمی اپنی طرف آتے دیکھے تو وہ بھاگ گیا۔

## بساؤ یا طلاق دو

اے۔ ایس۔ آئی نادر خان نے رات کو حمید کے گھر چھاپہ مارا اور اُسے گرفتار کر لیا۔ اس سے پہلے اُسے گرفتاری کے لئے کافی شہادتیں مل چکی تھیں۔ ایک تو مخدوم علی کے چار مزارعے تھے جو حمید کو پکڑنے کو دوڑے تھے۔ دوسرے مقتول کی بیوی تھی جس نے نادر خان کو بتایا کہ حمید اُس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اس عورت نے اسے ہر بار کہا کہ وہ غریب تو ہے، بے غیرت نہیں مگر حمید اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ آخر اُس نے تنگ آ کر اپنے خاوند کو بتا دیا۔ خاوند (مقتول) نے حمید سے کہا کہ وہ غریب سا ملازم ہے لیکن اپنی عزت کی خاطر بڑے سے بڑے جاگیردار کو قتل کرنے سے بھی نہیں ڈرے گا۔

مقتول کی بیوی نے بیان میں بتایا کہ حمید نے اُسے دھمکی دی کہ وہ اسے اغوا کرا دے گا۔ اس عورت نے اُسے کہا کہ وہ مخدوم علی کو بتائے گی لیکن اُس نے مخدوم علی کو تو نہ بتایا۔ اپنے خاوند سے کہا کہ اس کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ اُسی روز میاں بیوی نے مخدوم علی کو بتا

دیا۔ مخدوم علی گاؤں کا سرکردہ زمیندار تھا۔ گاؤں پہ اُس کا رُعب چلتا تھا۔ اُس نے حمید کو اپنے گھر بلایا۔ حمید کسی کا مزارعہ نہیں تھا۔ اُس کی اپنی زمین تھی اور ذات کے لحاظ سے بھی کمتر نہیں تھا لیکن مالی لحاظ سے وہ مخدوم علی کے مقابلے میں معمولی سا کسان تھا۔

مخدوم علی نے مقتول سے کہا کہ حمید کے سَر پر دو جُوتے مارو۔ مخدوم علی نے اور اس کے بیٹے نے حمید کو پکڑ لیا اور مقتول نے جو نادار سا ملازم تھا حمید کے سَر پر جُوتے مارے۔ اگلے ہی روز مقتول حمید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ مخدوم علی نے اس بیان کی تصدیق کرتے ہوئے نادر خان کو بتایا تھا کہ اُس نے اپنے ملازم (مقتول) کے ہاتھوں حمید کے سَر پر جُوتے مروائے تھے اور حمید نے اُس کے گھر سے نکلتے ہوئے مقتول سے کہا تھا ـــ "کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔"

اے۔ ایس۔ آئی نادر خان کے لئے یہ شہادت کافی تھی کہ قاتل حمید ہے۔ اگر وہ قاتل نہ ہوتا تو جاتے واردات سے بھاگتا کیوں؟ نادر خان کو اس تھانے میں دو سال ہو گئے تھے۔ وہ علاقے کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ حمید کا اُٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ ہے اور وہ اچھے چال چلن کا آدمی نہیں۔

حمید کے متعلق مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اس کا ایک چچا اور ایک ماموں ہے اور وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ دو سال ہوئے اس کی شادی بڑے اچھے گھرانے میں ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا کہ وہ ایک سال اس کے ساتھ بڑی مشکل سے گزار کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ حمید اُسے اپنے گھر لانے کو نہیں گیا۔ ماں باپ اس سے طلاق مانگتے ہیں تو طلاق بھی نہیں دیتا۔ مخدوم علی نے بھی اسے کئی بار کہا تھا کہ اپنی بیوی کو بسا دو یا اسے طلاق دے دو لیکن وہ ہر کسی کے گلے پڑ جاتا ہے اور بات کسی کی بھی نہیں مانتا۔

اب نادر خان گزشتہ دن اور رات حمید کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ



اقبالِ جُرم کر لے لیکن وہ نہیں مان رہا تھا۔ کہتا تھا کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے نادر خان کی ڈائری دیکھی۔ اس کی باتیں سُنیں تو میں سوچنے لگا کہ اقبالِ جرم کی ضرورت ہے یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی ایسی ضرورت نہیں پھر بھی میں نے سوچا کہ حمید سے بات کر دیکھوں۔ اگر مان جاتے تو بہتر ہے ورنہ اس کی ہڈی پسلی ایک کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

## کلہاڑی پر خُون تھا

رات کے ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ میں میں بول رہا تھا اور وہ بازو پھیلا کر انگڑائیاں لینے لگا پھر وہ اُٹھا اور کہنے لگا ـــ "جسم جُڑ گیا ہے۔ ذرا سیدھا کر لوں۔"

اُس نے اچانک ہرن کی طرح چوکڑی بھری۔ برآمدے کی تین سیڑھیاں تھیں۔ آگے پچیس تیس قدم میدان اور اُس کے آگے احاطے کی دیوار تھی جو چار فٹ کے قریب اونچی تھی۔ وہ پھاٹک کی طرف نہ گیا۔ بائیں طرف کو دوڑا۔ میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے پیچھے دوڑا۔ نادر خان باہر چارپائی پر بیٹھا تھا، وہ بھی دوڑا۔ تین چار کانسٹیبل بھی تعاقب میں گئے لیکن حمید اس قدر تیز نکلا کہ احاطے کی دیوار پھلانگ گیا۔ اُس طرف اندھیرا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ باہر کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

کانسٹیبل بھی دیوار پھلانگ گئے۔ میں رُک گیا۔ دو کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ پرائیویٹ کپڑوں میں ریلوے سٹیشن چلے جائیں۔ نادر خان نے کہا کہ حمید اپنے گاؤں جائے گا۔ میں نے کہا کہ وہ گاؤں میں نہیں جائے گا۔ اُس میں اتنی عقل ہوگی کہ وہ گاؤں میں گیا تو پولیس پیچھے آئے گی۔ وہ اپنے کسی بدمعاش دوست کے گھر گیا ہوگا۔

"تم کہتے ہو کہ اس کا اُٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ ہے" ـــ میں نے نادر خان سے کہا ـــ "وہ کون سے بدمعاش ہیں؟ اُن کے گھروں

پر چھاپے ماریں گے۔"

"میں معلوم کر کے بتاؤں گا"— نادر خان نے کہا۔

میں نے قصبے میں کانسٹیبل بھیج دیئے۔ انہیں کہا کہ وہ چوکیداروں کو ساتھ لے لیں اور گلی گلی گھوم جائیں۔ میں نے اُس کے گاؤں کو ذہن سے اُتار دیا تھا۔ وہ پاگل تو نہیں تھا کہ اپنے گھر چلا جاتا۔ گاؤں کے لوگ اُسے اُسی وقت گرفتار کرا دیتے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ قاتل ہے۔

مفرور ملزم کو پکڑنے کے لئے جو اقدام اور کارروائیاں کی جاتی ہیں وہ میں نے کیں۔ ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔ مجھے پچھتاوا ہُوا کہ میں نے اسے ہتھکڑی لگائے بغیر حوالات سے نکال لیا تھا۔ ملزموں کے معاملے میں بہت احتیاط کی جاتی ہے۔ میں نے اس لئے احتیاط نہ کی کہ اسے نادر خان نے بہت مارا پیٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چلنے کے بھی قابل نہیں ہوگا مگر وہ اتنا تیز دوڑا کہ جنوں کی طرح غائب ہو گیا۔

نادر خان میرے پیچھے پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اسے ہتھکڑی کے بغیر باہر نہیں نکالنا چاہیئے تھا اور یہ اس سلوک کے قابل نہیں جو اس کے ساتھ آپ نے کیا ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک قاتل کا بھاگ جانا سنگین معاملہ تھا۔ میں نے اس کے گاؤں کو دو کانسٹیبل بھیج دیئے۔

ان انتظامات اور باتوں میں کم و بیش دو گھنٹے گزر گئے۔ آدھی رات ہو گئی تھی۔ نیند ختم ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ قتل کے ملزم کو بھگا دینا معمولی جرم نہیں تھا۔ جھوٹ موٹ کا بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ آج کل تو قاتل دندناتے پھرتے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں، وہ زمانہ کچھ اور تھا۔

میں اپنے دفتر میں پریشان بیٹھا تھا کہ ایک کانسٹیبل دوڑتا میرے دفتر میں آیا اور ہڑبڑا کر بولا —"ملک صاحب! وہ آگیا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی ہے۔"

میں باہر نکلا۔ وہ آرہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پانچ چھ قدم دُور آکر کلہاڑی



میرے آگے پھینک دی۔ بلب کی روشنی میں صاف نظر آگیا کہ کلہاڑی خون آلود ہے۔

"اب اقبالی بیان دوں گا"— اُس نے میرے قریب آکر کہا —"اب قاتل ہوں۔ پہلے بے گناہ تھا۔ اب دو آدمیوں کو قتل کر کے آیا ہوں۔"

وہ برآمدے میں اس طرح بے پرواہی سے بیٹھ گیا جیسے میں نے اسے کوئی کام کرنے کو بھیجا تھا اور وہ کر آیا ہے۔ اُس کے انداز میں اور لہجے میں ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے پہلوان کُشتی جیت کر اکھاڑے کے کنارے ستانے اور تماشائیوں سے داد وصول کرنے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔ مجھے ایسے لگا جیسے اُس نے مجھے بھی قتل کر دیا ہو۔ وہ میری حراست سے بھاگا اور قتل کر آیا تھا۔ مجھ پر یہ الزام عائد ہو سکتا تھا کہ میں نے اسے ان دو آدمیوں کو قتل کرنے کے لئے ہی آزاد کیا تھا۔

"حوالات میں چلا جاؤں؟"— اُس نے مجھے چُپ چاپ دیکھ کر مجھ سے پوچھا —"یا پہلے آپ بیان لیں گے؟ .... پانی پینے کی اجازت ہے؟"

میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اسے پانی پلاؤ اور اسے کہا کہ وہ حوالات میں چلے۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ اُٹھ کر اُس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور سکون کی آہ لے کر بولا —"میرے سارے دکھ ختم ہو گئے ہیں۔ روح بھی راضی ہو گئی ہے۔"

وہ پانی پی کر خود ہی حوالات کی طرف چل پڑا۔ تھانے کے پھاٹک میں دس بارہ آدمی داخل ہوتے۔ میں نے جن دو کانسٹیبلوں کو اس کے گاؤں بھیجا تھا وہ آگے آگے تھے۔ حمید حوالات کی طرف جاتے جاتے رُک گیا اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے بولا —"اوئے تم سارا گاؤں کیوں آگئے ہو۔ میں خود ہی آگیا ہوں۔ کلہاڑی پولیس کے حوالے کر دی ہے"— اُس نے گالی دے کر کہا —"اب جھوٹ نہ بولنا"— اور اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

گاؤں کے جو آدمی آتے تھے انہوں نے مجھے یہ رپورٹ دی کہ

حمید مخدوم علی اور ایک پیر کو جو صوفی کہلاتا تھا، قتل کر آیا ہے۔ پہلے جس کے قتل کے الزام میں حمید پکڑا ہُوا تھا وہ مقتول مخدوم علی کا لڑکا تھا۔

اب حمید نے دوسری واردات اس طرح کی کہ (مخدوم علی کے جوان بیٹے کے بیان کے مطابق) گھر کے افراد صحن اور برآمدے میں سوتے ہوتے تھے۔ بیٹے کی چارپائی برآمدے میں تھی۔ کچھ شور ہُوا اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ عورتوں نے چیخ و پکار کی۔ بیٹا دوڑا آیا۔ ایک آدمی دیوار پھلانگ کر جا رہا تھا۔ مخدوم علی کا بیٹا لاٹھی یا کلہاڑی اٹھانے کو دوڑا۔ وہ آدمی جو دیوار پھلانگ کر جا رہا تھا اُس نے دیوار پہ کھڑے ہو کر کہا —— "میں حمیدا ہوں۔ چوہدری کو قتل کر کے جا رہا ہوں۔ دیکھ لو کتّا چارپائی پر پڑا ہے۔"

مقتول کے بیٹے نے دیکھا کہ اُس کا باپ اپنے بستر پر خون میں نہایا پڑا تھا۔ خُون سے اُس کا مُنہ سر ایک ہو گیا تھا۔ حمید نے کلہاڑیاں مُنہ اور سر پہ ہی ماری تھیں۔ وہ مر چکا تھا۔ مقتول کا بیٹا کلہاڑی لے کر باہر کو دوڑا۔ عورتوں کی چیخ و پکار سُن کر گاؤں کے لوگ جاگے اور باہر نکل آئے۔ مقتول کا بیٹا پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا۔ اتنے میں گاؤں کے دوسرے کونے سے ایسی ہی ایک اور چیخ و پکار اُٹھی۔ عورتوں اور بچّوں کا شور تھا۔ لوگ اُدھر کو دوڑ پڑے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ صوفی لہولہان پڑا ہے۔ اُسے بھی حمید نے سوتے میں مُنہ اور سر پر کلہاڑیاں مار کر قتل کر دیا تھا اور جاتے جاتے اعلان کر گیا تھا کہ میں حمیدا ہوں۔

اب حمید ابھی میرے پاس تھا اور اُس کی کلہاڑی بھی جس پر ایک بڑے زمیندار اور ایک پیر کا خُون ابھی تازہ تھا۔ مجھے کچھ کچھ پتہ چل گیا کہ قتل کا پس منظر کیا ہے۔ "بڑا زمیندار" اور پیر گاؤں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ حمید ان کا ستایا ہُوا ہوگا۔ مخدوم علی کو اُس نے کسی ایسے ہی پس منظر میں قتل کیا ہوگا۔



# وہ پلنگ پر اکیلا نہیں تھا

لاشیں وہیں پڑی تھیں جہاں حمید چھوڑ آیا تھا۔ میں اُسی وقت گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ میں اپنے بچاؤ کے بہانے بھی سوچتا جا رہا تھا۔ اگر حمید کو تھانے میں مشتبہ بٹھایا ہوتا اور وہ بھاگ جاتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی گرفتاری ریکارڈ پر آ گئی تھی اور نادر خان اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لے چکا تھا۔ یہ حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی تھی کہ ملزم حراست سے بھاگا اور ایک ہی بار قتل کی دو وارداتیں کر آیا۔

زمیندار مخدوم علی مقتول کا مکان پکّا تھا جیسے بڑے بڑے زمینداروں کا ہُوا کرتا ہے لیکن ایک طرف کی دیوار اتنی ہی اونچی تھی کہ اچھے قد کا آدمی بازو اُوپر اُٹھاتے تو انگلیاں دیوار کے اُوپر تک چلی جاتی تھیں۔ لالٹینوں کا انتظام تھا۔ میں نے وہاں زمین پر جہاں حمید اُوپر گیا اور اُدھر سے باہر کُودا، پاؤں کے نشان دیکھے۔ دیوار پر پاؤں کی رگڑ کے نشان تھے۔ اندر جا کر دیکھا۔ اُدھر بھی دیوار پر رگڑ کے نشان تھے اور کچے صحن میں پاؤں کے نشان تھے۔ مخدوم علی کی لاش چارپائی پر پڑی تھی۔ قاتل نے اُسے اُٹھنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اُس کے چہرے کا قیمہ کیا ہُوا تھا۔ سر میں بھی کلہاڑی کے گہرے زخم تھے۔ کھوپڑی ٹوٹی تھی۔

میں نے اس مکان کو اور لاش کے اردگرد جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ کاغذات تیار کئے۔ گواہوں کے انگوٹھے لگوائے اور گھر کے جن افراد کو موقعہ کا گواہ بنانا تھا انہیں تھانے چلنے کو کہا اور میں دوسرے مقتول کے گھر چلا گیا۔

اُسے گاؤں والے صوفی صاحب کہتے تھے اور سارا گاؤں اس کا مرید تھا۔ چند دوسرے دیہات کے لوگ بھی اس کے مرید تھے۔ یہ کوئی گدّی نہیں تھی جیسی پیروں اور "شاہ صاحبوں" کی ہُوا کرتی ہے۔ اس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ مقتول کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ تیس پینتیس سال پہلے یہاں آیا تھا۔

اُس نے عبادت کے کچھ ایسے طریقے اختیار کر رکھے تھے جن سے دیہات کے سارے لوگ بہت متاثر ہوئے تھے۔ مثلاً پورا ایک مہینہ صرف پانی پینا اور خاموشی اختیار کر لینی۔ مراقبے میں بیٹھ جانا اور کوئی ورد کرتے رہنا۔ اُس نے ایک طریقۂ عبادت یہ بھی اختیار کیا کہ گاؤں والوں نے اسے جو مکان دیا تھا اس کے ایک کمرے میں اُس نے اپنے قد جتنا گہرا گڑھا کھدوایا۔ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ اس کے کندھوں اور گڑھے کی دائیں بائیں کی دیواروں کے درمیان چار پانچ اِنچ کا فاصلہ رہ جاتا تھا یعنی اس گڑھے میں وہ صرف کھڑا رہ سکتا تھا، اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس گڑھے میں وہ سال میں ایک مہینہ مسلسل کھڑا رہتا تھا۔

رات کو وہ قریب ہی ایک ندی میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ پانی ٹخنوں تک ہوتا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ اوٹ پٹانگ نعرے لگاتا اور رات گزار دیتا تھا۔ پسماندہ لوگ اس قسم کے آدمیوں سے متاثر ہو جایا کرتے ہیں۔ اس میں دوسری خوبیاں یہ تھیں کہ زبان میٹھی اور پُر اثر تھی۔ باتوں سے دل موہ لیتا تھا۔ دوسری خوبی اُس کی جسمانی صحت تھی اور چہرے کی کشش۔ وہ شاید کالا علم جانتا تھا۔ لوگ اُس کے معتقد تھے اور باقاعدہ مرید۔ عقیدت مندی کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے قتل پر رو رہے تھے اور بعض عورتیں بین کر رہی تھیں۔

اُس کی لاش اُس کے پلنگ پر کمرے میں پڑی تھی۔ لاش کے چہرے اور سر کا وہی حال تھا جو میں نے مخدوم علی کا دیکھا تھا۔ یہاں حمید کو یہ سہولت مل گئی کہ باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ باہر والا دروازہ رات کو کھلا ہی رہتا تھا کیونکہ صوفی صاحب کے گھر میں کوئی بُری نیت سے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

صوفی پلنگ پر اکیلا نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے بتایا کہ وہ سوتے ہوتے تھے کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے جلتی ہوئی دیا سلائی نظر آئی۔ وہ ڈر گئی۔ دیا سلائی بجھ گئی اور اس آدمی نے صوفی کے مُنہ اور سر پر کلہاڑیاں مارنی شروع



کر دیں۔ صوفی کی بیوی چیختی چلاتی باہر کو دوڑی۔ اندر سوئی ہوئی دو عورتیں اور بچے جاگ اُٹھے۔ سب چیخنے چلانے لگے۔ دروازے میں ایک آدمی سائے کی طرح کھڑا تھا۔

"میں حمید ہوں" —— وہ کہہ رہا تھا —— "کہو صوفی کو اپنے مُردے میں جان ڈال لے" —— اور وہ گالیاں دیتا ہوا گاؤں سے نکل گیا۔

اس لاش کی بھی جو کارروائی کرنی تھی وہ کی اور صوفی کی بیوی کو تھانے چلے جانے کو کہا اور دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کیا۔ یہ کارروائیاں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ اسی میں رات گزر گئی۔ میں نے لوگوں کے چہرے صبح کی روشنی میں دیکھے۔ اُن پر خوف و ہراس کا ایسا غلبہ تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ بات بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ تو پسماندگی کا زمانہ تھا۔ اب بھی دیہات میں (اور شہروں میں بھی) لوگ اس قسم کے "صوفیوں" کو (جو در اصل صوفی نہیں ہوتے) خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان "پہنچ والے" پیروں سے موت بھی ڈرتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا "پہنچ والا" صوفی کیسی بُری موت مرا ہے لیکن عقیدت زندہ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اس کا مقبرہ بنائیں گے اور اپنے جیسے ایک آدمی کے ہاتھوں قتل کئے ہوتے اس "صوفی" کو اپنے ہاتھوں زمین میں دبا کر اور اس پر خود ہی مقبرہ تعمیر کر کے اس میں آ کر ماتھے رگڑا کریں گے۔

## بدکار آدمی تھا

تھانے آ کر میں نے عینی شاہدوں کے بیان لکھنے شروع کئے۔ ایک تو مخدوم علی کا بیٹا تھا، دوسری صوفی کی بیوی تھی۔ میں ان سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حمید کے ساتھ ان کی کیا دشمنی تھی کہ اس نے دونوں کو قتل کر دیا۔ صوفی کی بیوی نے کہا کہ اُسے کچھ بھی معلوم نہیں اور مخدوم علی کے بیٹے نے وہی بیان دے دیا جو اس نے اپنے نوکر کے قتل کے سلسلے میں

نادر خان کو دیا تھا، یعنی حمید ان کے نوکر کی بیوی کو چھیڑتا تھا۔ مخدوم علی کو پتہ چلا تو اس نے حمید کو اپنے گھر بلا کر اپنے نوکر سے جوتے مروائے۔

قتل کا یہ باعث کافی تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ حمید تھا تو دیہاتی اور ان پڑھ لیکن اُس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ صاف ستھرے اور بہتر ذہن کا جوان ہے۔ اس کی غیرت نے اپنی بے عزتی برداشت نہ کی اس لئے اس نے پہلے نوکر کو قتل کیا اور دیکھا کہ وہ پکڑا گیا ہے اور اُسے سزا ملے گی تو اُس نے مخدوم علی کو بھی قتل کر دیا۔

گاؤں کا نمبردار، ذیلدار اور چوکیدار تھانے میں موجود تھے۔ مجھے ان سے بہت کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی لیکن بعض کیسوں میں یہ لوگ بھی اصل بات پر پردہ ڈال دیا کرتے تھے۔ اس کیس میں مجھے یہی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ چونکہ ملزم معمولی آدمی اور مقتول سرکردہ افراد تھے اس لئے میں توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ یہ لوگ ملزم کی حمایت میں کوئی بات بتائیں گے۔ میں نے ملزم کا بیان لینا بہتر سمجھا۔ اُسے ہتھکڑی لگا کر حوالات سے نکالا اور اپنے دفتر میں لے گیا۔

"حمیدے بھائی!" — میں نے اُسے کہا — "جہاں تم دو قتل کر کے خود ہی کلہاڑی سمیت میرے پاس آ گئے ہو وہاں اب پہلے قتل کا بھی اقبال کر لو۔ اسے بھی تم ہی نے قتل کیا ہے۔"

"میں اب دس اور قتل کر دوں تو پھانسی ایک ہی بار ملے گی" — اس نے بڑے پختہ لہجے میں کہا — "اگر آپ قتل کے کسی اور ملزم کو بچانا چاہتے ہیں تو میں اقبالی بیان دے دیتا ہوں کہ وہ قتل بھی میں نے کیا ہے لیکن میں نے جو قتل نہیں کیا وہ میں کیسے مان جاؤں۔"

"پھر اس نوکر کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"میں کسی پر ایسا الزام نہیں لگاؤں گا جس کا مجھے یقین نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے شک ہے کہ اُسے مخدوم علی کے بیٹے کرم اللہ نے قتل کیا ہے.... کرم اللہ ہی ہے جس نے اپنے مزارعے میرے پیچھے دوڑائے تھے کہ اسے پکڑو۔"



"پھر تم بھاگ کیوں گئے تھے؟" — میں نے پوچھا — "قتل تم نے نہیں کیا تھا تو وہیں کھڑے رہتے اور کہتے کہ تم قاتل نہیں ہو۔"

"جناب! آپ تھانے میں بیٹھ کر بات کر رہے ہیں اور میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں" — اُس نے کہا — "اگر وہ لوگ مجھے پکڑ لیتے تو پہلے میری ہڈی پسلی ایک کرتے پھر مجھے سارے گاؤں میں ذلیل کرتے اور اگر میں مر جاتا تو ان زمینداروں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ آپ کا چھوٹا تھانیدار (نادر خان) مخدوم علی کے گھر کا نمک کھاتا ہے۔ اس خاندان کے ساتھ چھوٹے تھانیدار کا گہرا یارانہ ہے۔"

"صوفی کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"بدکار آدمی تھا جی!" — اُس نے ایسے بے خوف سے لہجے میں کہا جیسے بدکار آدمی کو قتل کرنا نیکی کا کام ہو — "وہ تو بہروپ کے باز تھا۔ مخدوم علی اس کا مرید تھا لیکن اندر سے اُن کا یارانہ تھا اور دونوں بدمعاشی کرتے تھے۔ دونوں میرے دشمن بنے ہوئے تھے۔ میں ان کا محتاج نہیں تھا ورنہ یہ مجھے اپنی جوتی میں روٹی رکھ کر دیتے۔"

میں اس کے ساتھ دوستی کے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی ہر بات اور ہر راستے کو سچ مان لیتا۔ ہر آدمی کے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ ملزم کی تو نفسیات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ سچ بولنا چاہے تو بھی اُس کی زبان سے ایک دو جھوٹ نکل جاتے ہیں لیکن حمید نے مجھ پر کچھ اور ہی تاثر پیدا کر دیا تھا۔ وہ چال چلنے، لباس اور ہر لحاظ سے دیہاتی تھا۔ اَن پڑھ تھا۔ اُس وقت ہم جسے نئی روشنی یا نئی تہذیب کہا کرتے تھے، اس کی اُسے ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ اس کا توہم پرست اور کسی نہ کسی پیر فقیر کا مرید ہونا ضروری تھا۔ دیہات میں "بے پیرا" ایک گالی سمجھی جاتی تھی، یعنی اس کا کوئی پیر نہیں اس لئے یہ قابلِ اعتبار اور قابلِ عزت نہیں اور اُس کی دنیا بھی خراب اور عاقبت بھی خراب ہے اور یہ خدا کا دھتکارا ہوا آدمی ہے۔

حمید نے جب بات شروع کی تو وہ دیہاتی پنجابی اور گنواروں جیسی اصطلاحیں بول رہا تھا لیکن اس کی باتوں میں دانش تھی۔ ایک پسماندہ معاشرے میں رہ کر وہ روشن دماغ تھا۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ علم اور دولت سے ہی دماغ روشن نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنی عقل استعمال کرے تو وہ روح کو روشنی سے منوّر کر سکتا ہے۔

## "اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو"

"آپ نے پوچھا ہے کہ صوفی کے ساتھ میری کیا دشمنی تھی" — اُس نے کہا — "کیا میں آپ کو ساری باتیں سُناؤں یا صرف یہ کہ میں نے مخدوم علی اور صوفی کو کس طرح قتل کیا ہے؟"

"تمہارے دل میں جو آتا ہے سنا دو" — میں نے کہا — "بات آج شروع کرو اور کل ختم کرو۔ میں توجّہ سے سُنتا رہوں گا۔"

اُس نے سنایا — "تین سال گزرے پہلے میرا باپ مرا اور پانچ مہینوں بعد میری ماں مر گئی۔ میرے دل میں یہی ایک بات آتی تھی کہ میں بھی مر جاؤں۔ چچا اور ماموں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ لیا لیکن ماں اور باپ کی کمی کوئی بھی پوری نہیں کر سکتا۔ میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ دن رات روتے گزرتے تھے۔ میں کسی کا محتاج نہ تھا۔ عمر بیس اکیس سال تھی۔ باپ کی اراضی کا اب میں مالک تھا۔ کام اور محنت سے میں گھبرانے والا آدمی نہیں تھا۔ میری ہانڈی چچا کے گھر ہوتی تھی لیکن ماں باپ کی موت کے غم نے ہنسی اور کھیل کود سے محروم کر دیا.....

"میرا باپ اس صوفی کا مرید تھا۔ مجھے بھی کبھی کبھی سلام کے لئے اس کے گھر لے جایا کرتا تھا۔ میں نے کبھی اِدھر توجّہ نہیں کی تھی کہ پیری مریدی کیا ہوتی ہے۔ لوگ صوفی کی کرامات سنایا کرتے تھے اور میں سُن کر حیران ہُوا کرتا تھا۔ میں بے پروا سا لڑکا ہُوا کرتا تھا۔ اب غموں نے مجھے دبا لیا تو میں کسی کام کا نہ رہا۔ مجھے بزرگ کہنے



لگے کہ اپنی زمین کو تم خود ہی سنبھالو گے اور تمہاری منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اگر تم اسی طرح غم کرتے رہے تو زمینیں ویران ہو جائیں گی اور اس لڑکی کے ماں باپ منگنی توڑ دیں گے۔ اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے ....

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنے آپ کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ جس لڑکی کے ساتھ میرے ماں باپ نے میری منگنی کی تھی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ میری منگنی ٹوٹ جاتے اور وہ کسی اور کی بیوی بنے۔ میں دِل کے سکون کے لئے صوفی کے پاس چلا گیا اور اس کے پاؤں پکڑ کر بہت رویا۔ میں نے اسے اپنے دل کا حال بتایا اور کہا کہ کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرے دل سے ماں باپ کا غم مٹ جاتے۔ صوفی نے مجھے دو تعویذ دیئے۔ ایک گلے سے باندھنے کے لئے اور دوسرا پانی میں گھول کر پینے کے لئے ....

"صوفی شفقت سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ بھی دیکھا۔ میری آنکھوں میں بھی دیکھا اور کہنے لگا — 'تم نادان بچے ہو۔ غیب کی باتیں تم نہیں سمجھ سکتے۔ میں جو بتاتا ہوں اس پر عمل کرو ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے' — میں نے کہا کہ مجھے فوراً بتائیں۔ اُس نے کہا — 'اگر تمہاری شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تو تم دونوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ میں ابھی بتا نہیں سکتا کہ یہ نقصان کیسا ہو گا۔ تم دونوں کے ستارے آپس میں نہیں ملتے بلکہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ منگنی فوراً توڑ دو۔ اُس کے ماں باپ کو جواب دے دو'...

"میں نے صوفی سے کہا کہ میں اس کی نصیحت پر عمل کروں گا لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ میں اس لڑکی سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں تین بار صوفی کے گھر گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کے تعویذوں کا مجھ پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہُوا۔ اُس نے پھر بھی کہا کہ اس لڑکی سے منگنی توڑ دو۔ وہ کہتا تھا — 'تمہارا نقصان شروع ہو چکا ہے۔ یہ صرف منگنی کا اثر ہے۔ اگر تم نے اس کے ساتھ شادی کر لی تو ہو سکتا ہے تمہاری ٹانگیں یا بازو یا آنکھیں ضائع ہو جائیں۔ اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو'...

"میں کچھ ڈرنے لگا۔ میرے دل میں آگئی تھی کہ منگنی توڑ دوں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایک روز میں پانچ چھ کوس دُور کے ایک گاؤں سے اپنے گاؤں کو واپس آ رہا تھا۔ راستے میں ایک آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا۔ وہ بھی میری طرح پیدل سفر میں تھا۔ وہ میری طرح دیہاتی نہیں تھا۔ شاید اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اس نے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر بالوں والی ٹوپی تھی۔ اُس کی داڑھی چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی تھی۔ میں بھی ذرا دم لینے کے لئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرے ساتھ اس طرح سلام دعا کی جیسے مجھے جانتا ہو۔ میں تو اُس کا نوکر یا مزارعہ لگتا تھا۔ وہ علم والا تھا۔ میں نے اُسے اپنے دل کا حال سنایا۔ اپنا غم اور اپنی پریشانی اُسے بتائی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے گاؤں میں ایک صوفی ہے جس نے مجھے تعویذ دیتے ہیں لیکن ڈیڑھ دو مہینے گزر گئے ہیں میری حالت ٹھیک نہیں ہوتی ....

"اُس نے مجھ سے پوچھا — تم خدا سے کیوں نہیں مانگتے؟ زندگی خُدا دیتا ہے اور خدا ہی زندگی واپس لیتا ہے۔ غم بھی خدا دیتا ہے اور خوشی بھی خدا دیتا ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ صوفی تمہیں ایک منٹ کی بھی خوشی نہیں دے سکا۔ تم نماز پڑھو۔ خدا کے ساتھ خود بات کرو۔ انسانوں سے تمہیں کچھ حاصل ہوگا تو وہ دُکھ، تکلیف اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہوگا — اُس نے ایسی باتیں کیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھیں۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ صوفی کے تعویذوں کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہُوا تھا۔ اس پڑھے لکھے شخص نے جو باتیں کیں ان کا مجھ پر بہت اثر ہُوا۔ میں نے خدا کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اپنا مرید بنا لو ....

"اُس نے کہا — 'تم لوگوں میں یہی خرابی ہے کہ تم پیری اور مریدی کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ اپنے خدا کے اور اس کے کلام کے مرید بنو .... اپنے مرید بن جاؤ۔ تمہارے صوفی پیر کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں، طاقت تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہیں یہ طاقت خدا نے دی ہے' —



جناب عالی! میں آپ کو وہ الفاظ نہیں بتا سکتا جو اُس نے کہے تھے کیونکہ میں ان پڑھ ہوں۔ میں اُس کی ساری بات سمجھ گیا تھا کہ خدا نے جو طاقت مجھے دی ہے اس سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ علم والے اس شخص نے تو میری دنیا ہی بدل دی۔ مجھ پر اتنا اثر ہُوا کہ میں نے اُس کے سامنے اپنے گلے سے تعویذ نوچ کر پرے پھینک دیا۔"

## لڑکی صُوفی کی مریدنی تھی

اُس کے بیان کا یہ حصّہ بہت طویل تھا۔ میں پوری دلچسپی سے سُنتا رہا اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا۔

"میں نے اُسی روز اس کی نصیحتوں پر عمل شروع کر دیا" — اُس نے کہا — "میں نے نماز پڑھی اور خدا کے آگے ہاتھ پھیلا کر بہت رویا اور خدا سے دل کا سکون مانگا۔ آپ یقین کریں کہ میرے دل کو سہارا مل گیا۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ مجھے صوفی کے نام سے چڑ ہو گئی۔"

اس سے آگے اُس کے بیان کو میں مختصر کر کے سناتا ہوں۔ اس نے ایسا رویہ اختیار کر لیا جو دیہاتی معاشرے میں جُرم سمجھا جاتا ہے۔ صوفی نے اسے دو تین بار بلایا تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ آخری بار اُس نے صوفی کو کہلا بھیجا کہ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ میں تمہیں پہنچ والا پیر مانتا ہوں اور میں اسی لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا۔ اس کے بعد اس نے دوسرا جُرم یہ کیا کہ صوفی کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کی مخالفانہ باتیں صوفی کے کانوں تک پہنچیں اور وہ اُس کا دشمن ہو گیا۔ گاؤں میں اپنے پیر کے خلاف بھلا کون بات سُنتا ہے؟ گاؤں کے لوگ بھی اس کے خلاف ہو گئے۔

صوفی نے اُسے دھمکی بھیجی کہ وہ اس کے خلاف باتیں کرنے سے باز آ جائے۔ گاؤں کے بڑے اور با اثر زمیندار مخدوم علی نے بھی اسے روکا اور

دھمکی دی۔ حمید نے دونوں کی دھمکیوں کا مذاق اُڑایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں اپنے خدا کا مرید ہوں۔ اُسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ کمتر ذات کا نہیں تھا اس کی اپنی زمین تھی۔ وہ کسی کا محتاج نہیں تھا۔ وہ نڈر اور خودسر ہو گیا۔ اُس کے ساتھ کوئی رعب کی بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اپنی طاقت اور اپنے رعب کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اُس نے قریبی گاؤں کے تین چار بدمعاشوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ ان میں ایک جرائم پیشہ اور سزا یافتہ تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں اس جیسے دو "بے پیرے" موجود تھے۔ انہیں بھی اُس نے دوست بنا لیا۔ ان دوستوں نے حمید کا رعب جمانے کے لئے صوفی اور مخدوم علی تک کچھ دھمکی آمیز باتیں پہنچائیں۔

ان لوگوں کو اپنا رعب جمانے کے لئے ایک موقعہ مل گیا۔ اُونچی ذات کے ایک آدمی نے کمتر ذات کی ایک عورت پر دست درازی کی۔ وہ شریف عورت تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کو بتایا۔ خاوند نے اس آدمی سے گلہ کیا تو اُس نے خاوند کو دو چار تھپڑ مار کر خاموش کر دیا۔ حمید نے اپنے دوستوں کو بلا لیا۔ اُنہوں نے دست درازی کرنے والے کو گاؤں کے وسط میں پکڑ کر پہلے لوگوں کو اکٹھا کیا پھر اس آدمی کی پٹائی کر دی۔ اس کے خاندان کے مرد لاٹھیاں کلہاڑیاں لے کر نکل آتے۔ حمید نے انہیں للکار کر کہا کہ میں گاؤں کی ہر عورت کی عزت کی حفاظت کروں گا۔ اگر تم لوگوں نے مجھے لاٹھیوں کلہاڑیوں کی دھونس دکھائی تو تمہاری بیٹیوں کو ہم اسی طرح کھیتوں میں خراب کریں گے۔

غنڈے بدمعاشوں کا رُعب کام کر گیا لیکن حمید کے خلاف دشمنی جڑ پکڑ گئی۔ اُسے مخدوم علی کے خاندان نے غنڈہ بدمعاش کہنا شروع کر دیا۔ حمید کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اُس کے چچے اور ماموں نے اس کی شادی کر دی۔ یہی وہ لڑکی تھی جس سے صوفی اسے منگنی توڑنے کو کہتا تھا۔ لڑکی اُسے اسی طرح پسند کرتی تھی جس طرح وہ اُسے کرتا تھا۔ وہ پیار اور محبت کی ازدواجی زندگی گزارنے لگے لیکن آٹھ نو ماہ بعد لڑکی کے رویے میں ناگوار تبدیلی آنے لگی۔ اس کی وجہ



یہ تھی کہ لڑکی صوفی کی مریدنی تھی اور ہر جمعرات اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ صوفی کے سلام کے لئے جایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی اُس نے اپنا یہ معمول جاری رکھا۔ حمید اُسے روکتا تھا اور وہ حمید کو صوفی کے حق میں تائل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ آٹھ نو مہینے تو پیار محبت میں گزر گئے پھر ان میں ناچاقی پیدا ہونے لگی۔ لڑکی نے سرد مہری اور بے رُخی اختیار کر لی پھر محبت ختم ہو گئی آخر لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر گئی اور واپس نہ آئی۔

حمید اُسے گھر لانے کو نہ گیا۔ چند اور مہینے گزرے تو لڑکی والوں نے طلاق مانگنی شروع کر دی۔ حمید نے جواب دیا کہ خود گئی تھی خود واپس آجائے۔ میں اُسے بسانا چاہتا ہوں طلاق دینے کی کبھی نہیں سوچی تھی۔ مخدوم علی اور صوفی نے بھی اُسے کہا کہ وہ لڑکی کو طلاق دے دے۔ حمید نے انہیں بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔ ایک سال گزر گیا۔

## بیوی کی آنکھ کھُل گئی

حمید نے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا کہ وہ اپنے گاؤں کو آ رہا تھا جہاں مخدوم علی کا نوکر قتل ہوا تھا وہاں سے ذرا آگے زمین گہرائی میں ہے اور آگے برساتی نالے جیسی ندی ہے۔ حمید اس نالے میں سے گزر کر اُوپر آیا پھر گہرائی والی زمین سے اُوپر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ مخدوم علی کا بیٹا اس سے پچیس تیس قدم دُور کھڑا اپنے نیچے دیکھ رہا تھا۔ حمید کو نوکر کی لاش نظر آئی جسے وہ زخمی سمجھا۔ وہ وہیں رُک گیا۔ مخدوم علی کے بیٹے نے اُدھر دیکھا جدھر حمید کھڑا تھا۔ اُس نے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ کھیت ذرا بلندی پر تھے۔ وہ اُوپر گیا اور شور مچایا کہ بھاگ کر آؤ اسے (حمید کو) پکڑو۔

مخدوم علی کے مزارعے دوڑے آئے۔ اُس کے بیٹے نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دیکھو، حمید اِسے قتل کر کے وہ بھاگ گیا ہے۔ وہ سب حمید کو پکڑنے کے لئے دوڑے۔ حمید ڈرنے والا آدمی نہیں

تھا لیکن وہ اتنے زیادہ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے یہ ڈر محسوس ہُوا کہ یہاں معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر وہ رُکا رہا تو پہلے اس کی پٹائی ہو گی پھر اُسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اُس کی عقل ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ بھاگ اُٹھا۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ زمین پر جو آدمی زخمی یا مرا پڑا تھا وہ کون تھا۔

وہ شام کے بعد گھر آیا۔ تھوڑی دیر بعد اے۔ ایس۔ آئی نادر خان دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہُوا اور اسے پکڑ کر تھانے لے آیا۔ تھانے میں اُسے کہا کہ زمیندار کے نوکر کے قتل کا اقبال کرو۔ حمید نے کہا کہ اُس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ نادر خان نے اُسے کہا کہ اقبالی بیان دے دے اور وہ اسے بچا لے گا۔ حمید نے نادر خان کو بتایا کہ وہ دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا تو اُس نے مخدوم علی کے بیٹے کو ایک آدمی کی لاش کے پاس کھڑے دیکھا۔ نادر خان نے اس کے بیان کو تسلیم نہ کیا اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ اسے اذیتیں دیں، اور اس دوران نادر خان نے اسے دو بار کہا —"میں دیکھتا ہوں تم اسے طلاق کس طرح نہیں دو گے۔"

حمید سمجھ گیا کہ یہ چکّر کیا ہے۔ اُس نے نادر خان کو بہت بُری سُنائیں اور کہا کہ میں اگر اپنے باپ کا بیٹا ہُوا تو نہ طلاق دوں گا نہ تمہاری مرضی کے مطابق اقبال جُرم کروں گا۔ میرے جسم کے ٹکڑے کر دو۔ نادر خان نے اُس کے جسم کے ٹکڑے کرنے میں کوئی کسر نہ رہنے دی لیکن حمید بڑا سخت جان نکلا۔ اتنے میں میں آگیا اور اسے بچا لیا۔

"میں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اب آپ کے اس چھوٹے تھانیدار سے مار نہیں کھاؤں گا"— حمید نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا—"اب مجھے حوالات سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے جاتے گا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ قتل کس طرح کروں گا، لیکن آپ نے مجھے بلا لیا اور پاس بٹھا کر بڑے پیار سے باتیں کیں۔ میں آپ کے پیار کو دھوکہ سمجھ رہا تھا۔ مار کٹائی ناکام ہو چکی تھی، اب آپ محبّت کا ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔ میرے دل میں ایک اور ارادہ آگیا۔ میں دو تین بار جسم سیدھا کرنے کے



بہانے اُٹھا تھا اور بیٹھ گیا تھا۔ میں آپ کو دھوکہ دے رہا تھا کہ بھاگوں گا نہیں۔ پھر میں اُٹھا اور بھاگ گیا . . . .

"اپنا ارادہ پورا کرنے کے لئے میں دوڑتا ہُوا اپنے گاؤں پہنچا۔ مجھے ڈر تھا کہ پولیس میرے پیچھے آ رہی ہو گی۔ میں اس سے پہلے پہلے اپنا ارادہ پورا کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں اپنے گھر گیا اور کلہاڑی اُٹھا کر مخدوم علی کے مکان تک چلا گیا۔ باہر کی دیوار سے میں واقف تھا۔ میں ذرا سا اُچھلا تو ہاتھ دیوار پر چلے گئے۔ پاؤں دیوار کے ساتھ لگا کر میں اُوپر گیا اور دیوار سے اندر کو کُودا۔ ماچس جلا کر مخدوم علی کو پہچانا۔ میں پہلے اُس کے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے مخدوم علی نظر آ گیا۔ وہ گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے اور سر پر کلہاڑی کے چھ بھرپور وار کئے۔ صحن میں اس کے قریب دو عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ جاگ اُٹھیں اور اُنہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ وہاں سے میں مخدوم علی کے بیٹے کو قتل کئے بغیر بھاگ آیا۔ میں نے اسے بھی ختم کرنا تھا لیکن پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ میرا دوسرا ارادہ صوفی کو قتل کرنے کا تھا۔ اس ارادے کی وجہ سے میں مخدوم علی کے بیٹے کو قتل کئے بغیر وہاں سے بھاگ گیا....

"لوگوں کے اُٹھنے سے پہلے میں اُس گلی سے نکل گیا اور صوفی کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کُھل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ صوفی کہاں سوتا ہے۔ میں نے اُس کمرے میں جا کر ماچس جلائی اور پلنگ پر دیکھا۔ صوفی تو گہری نیند سویا ہُوا تھا، اُس کی بیوی کی آنکھ کُھل گئی۔ میں نے ماچس پھینکی اور اندھیرے میں صوفی کے سر پر کلہاڑی کے چھ وار گن کر کئے۔ اُس کی بیوی چیخیں مارتی اندر کو دوڑی اور میں باہر نکل آیا۔ باہر باہر سے ہوتا ہُوا تھانے میں آگیا۔"

## منگنی نہ توڑی

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم مقتول کی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے اور

مخدوم علی نے تمہیں اپنے گھر بلا کر جوتے مرواتے تھے؟"

اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور ہونٹ کُھل گئے۔ یہ حیرت کا تاثر تھا۔ گھبراہٹ نہیں تھی۔

"یہ کس نے کہا ہے؟" — اُس نے اسی تاثر میں پوچھا۔

"کسی نے تو کہا ہے نا!" — میں نے کہا — "میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کہاں تک سچ ہے؟"

"اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ یہ جھوٹ کس نے بولا ہے تو میں نے جہاں دو آدمیوں کو قتل کیا ہے وہاں ایک اور کا بھی قصہ پاک کر دیتا" — اس نے کہا اور میری ران پر ہاتھ رکھ کر بولا — "جناب عالی! اپنے دل پر لکھ لیں کہ میں خدا کا مرید ہوں۔ جھوٹ بولوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ میں اگر عورت کا اتنا شوقین ہوتا تو اپنی بیوی کے پاؤں جا پڑتا کہ میرے ساتھ چلو، تم جو کہو گی وہی کروں گا لیکن جناب! میں نے اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کو دھتکار کر پرے کر دیا۔ مقتول نوکر کی بیوی بیشک خوبصورت ہے لیکن وہ بدمعاش ہے اور بکاؤ مال ہے۔ میں اُسے خرید سکتا تھا۔ چھیڑ چھاڑ کی کیا ضرورت تھی؟ .... چلئے، میں نے اسے چھیڑا ہو گا مگر یہ جھوٹ کہ مخدوم علی نے مجھے جوتے مروائے؟ اس میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ مجھ پر ہاتھ اُٹھاتا! اگر ایسی بات ہوتی تو وہ اُسی روز قتل ہو جاتا اور میں خود تھانے میں آجاتا۔ میں نے اتنا ہی دیکھا تھا کہ تھانے میں اس کے مزارعے گواہی دینے آئے تھے، اور جناب عالی! آپ چاہے بُرا منائیں۔ آپ کا چھوٹا تھانیدار ان سے ملا ہوا ہے۔"

میں نے حمید کا بیان آگے سُننے سے پہلے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ مقتول نوکر کی بیوی اور دوسرے تمام ان مزارعوں کو ساتھ لے آئے جو مقتول نوکر کے قتل میں گواہ تھے۔

"میں تو سمجھا تھا کہ مخدوم علی نے تمہیں جوتے مرواتے تھے اس لئے تم نے اُسے قتل کیا ہے" — میں نے کہا — "اگر ایسی بات نہیں تھی تو تم



نے اسے کیوں قتل کیا ہے؟"

"یہ بھی سن لیں" — اس نے جواب دیا — "آپ ولایت سے تو نہیں آئے۔ ہم جیسے ہی ہیں نا! آپ کو معلوم ہو گا کہ گاؤں میں کوئی بات زمین کے نیچے جا کر کریں تو وہ بھی لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح مجھے باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ مخدوم علی کا ایک بھتیجا جوان ہے۔ اسے وہ میری منگیتر کا رشتہ دلانا چاہتا تھا جو اُسے نہیں مل سکتا تھا۔ میری بیوی کی ماں اس کی پیدائش سے پہلے کی صوفی کی مریدنی ہے۔ وہ بڑی خوبصورت عورت ہے۔ اب بھی صوفی کے پاس جاتی ہے لیکن اُس وقت جب صوفی کسی سے ملتا ہی نہیں۔ گرمیوں کی دوپہر کے وقت جاتی ہے یا سردیوں میں شام کے بعد۔"

مجھے اچانک یاد آگیا کہ حمید نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ صوفی کا مرید بنا تو صوفی نے اُسے کہا تھا کہ منگنی توڑ دے کیونکہ اس کی منگیتر کا ستارہ حمید کے ستارے کے خلاف ہے۔ اس کے بعد بھی صوفی اسے کہتا رہا کہ منگنی توڑ دو۔ حمید نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ مخدوم علی اور صوفی کی گہری دوستی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں بلکہ لڑکی کی ماں بھی یہ رشتہ کسی اور کو دینا چاہتے تھے۔

"تم نے منگنی نہ توڑی" — میں نے حمید سے کہا — "جب تم نے اپنی بیوی کے ماں باپ سے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تھا تو وہ فوراً مان گئے تھے؟"

"کہاں فوراً جی!" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو ٹال رہے تھے۔ میں اُن کے پیچھے پڑا رہا۔ میری ساس نے ایک روز مجھے کہا کہ تم بہت بدنام ہو گئے ہو اس لئے ہم کچھ سوچ رہے ہیں .... وہ مجھ پر جھوٹا الزام تھوپ رہی تھی۔ میرا سسر شریف آدمی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں شادی کا دن فوراً مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر منگنی میں گڑبڑ کی گئی تو میں لڑکی کو اٹھا کر لے جاؤں گا خواہ میں قتل ہو جاؤں۔ میں اُن آدمیوں اور دو عورتوں کو تھانے بلا دوں گا جو گواہ ہیں کہ مخدوم علی اور صوفی میری ساس اور سسر کو مجبور کر رہے تھے کہ

منگنی توڑ دیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ گاؤں میں منگنی توڑنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میرا سسر آخر مرد ہے۔ وہ اپنی زبان سے نہ پھرا اور اس نے شادی کا دن مقرر کر دیا۔"

## عورت شریف نہیں تھی

میں دشمنی کی وجہ سمجھ گیا۔ شہروں میں رہنے والوں اور نئی روشنی کے لوگوں کی نظر میں دشمنی کی یہ وجہ اتنی سنگین نہیں ہو گی کہ قتل تک نوبت پہنچے لیکن دیہاتی معاشرے میں اس سے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں خون خرابے کا باعث بن جاتی ہیں۔ شہروں میں قتل نہیں ہوتے لیکن ایسی ہی ذرا ذرا سی باتوں پر ازدواجی زندگیاں تباہ ہوتی اور خاندانوں میں ناچاقی کا باعث بنتی ہیں۔ میں نے تعلیم یافتہ شہری خاندانوں میں بھی یہی حالت دیکھی ہے۔

میں نے حمید کو حوالات میں بند کر دیا۔ اپنے اے۔ ایس۔ آئی نادر خان سے میں نے کچھ نہ پوچھا۔ مجھے بغیر ثبوت کے یقین تھا کہ اس نے مخدوم علی اور صوفی سے "نذر نیاز" وصول کی ہو گی اور اس نے حمید کو نوکر کے قتل کے الزام میں بے گناہ پکڑ لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ حمید کو کس طرح بیگناہ پھانسا گیا۔ یہ سکیم کیا تھی اور کس طرح بنی۔

وہ تمام گواہ آ گئے جو نوکر کے قتل کے گواہ تھے۔ ان میں مقتول کی بیوی بھی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو بلایا۔ وہ دلکش عورت تھی۔ وہ عورتوں کی اس قسم میں سے تھی جو زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ خاص قسم کی دلکشی ہوتی ہے۔ ایسی عورتوں کی آنکھیں مسکرایا کرتی ہیں اور وہ اتنی زیادہ چالاک اور فریب کار ہوتی ہیں جہاں تک کسی شریف آدمی کا تصور نہیں پہنچ سکتا۔ ان کا چال چلن بہت برا ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ ہر کسی کی ہو جائیں۔ اگر یہ غریب ہوں تو بھی بڑے بڑے چوہدریوں کو انگلیوں پر نچا دیتی ہیں۔ انہیں جرائم پیشہ لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں یا تھانیدار۔ مقتول کی بیوی مجھے ایسی ہی نظر آتی۔



اس نے رونی صورت بنا رکھی تھی کیونکہ وہ بیوہ ہو چکی تھی۔

"سنا ہے حمیدا تمہیں چھیڑتا تھا" — میں نے پوچھا — "کیا کہتا تھا؟"

اس نے ایک بیہودہ بات کہہ دی کہ اکثر یہ کہتا تھا۔

"یہ نہیں کہتا تھا کہ پیسے دوں گا، ریشمی کپڑوں کا جوڑا دوں گا؟" — میں نے پوچھا — "یا مفت چھیڑخانی کرتا تھا؟"

"سب کچھ کہتا تھا" — اس نے جواب دیا۔

"پھر؟ .... تمہیں کیا اعتراض تھا؟" — میں نے پوچھا — "کیا یہ آدمی تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا؟ .... جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ گاؤں کا نمبردار، ذیلدار، چوکیدار اور گاؤں کے کئی آدمی تھانے میں موجود ہیں۔ میں ان سے پتہ کرا لوں گا کہ تم کیسی عورت ہو۔ اپنی زبان سے نہ کہنا کہ تم شریف عورت ہو.... حمیدے نے تم سے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ بولو، یہ سچ ہے یا جھوٹ؟"

اس نے پہلے سر جھکایا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ میرے لئے یہی خاموش جواب کافی تھا۔ میں اس کی طرف جھکا۔

"اپنے خاوند کو قتل کیوں کروایا ہے؟" — میں نے رازداری سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ اتنی گھبرائی کہ اس کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو — "نہ جی! میں نے اسے قتل نہیں کرایا۔ اسے حمیدے نے قتل کیا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اسے حمیدے نے قتل کیا ہے؟"

"سب یہی کہتے تھے" — اس نے کہا — "میں تو گھر میں تھی۔"

"تم نے فوراً مان لیا تھا کہ قاتل حمیدا ہی ہے؟" — میں نے پوچھا — "تم نے یہ تو سوچا ہو گا کہ حمیدے کی تم لوگوں کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں جی!" — اس نے کہا — "میں تو چیخ چیخ کر کہتی تھی، اوئے حمیدے

"یہ بھی جھوٹ ہے کہ تمہارے خاوند نے مخدوم علی کو بتایا تھا کہ حمیدا

تُمہارا کب سے وَیری بنا ہے؟"

"پہلے تو وہ تمہارا وَیری نہیں تھا نا!" — میں نے کہا — "اب سچ ہی بولتی چلی جاؤ۔ تمہارے خاوند کی قبر ٹھنڈی ہو گی۔"

"سچ ہی بول رہی ہوں جی!" — اُس نے کہا۔

"ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو حوالات میں بند ہو جاؤ گی" — میں نے کہا — "گاؤں میں ہر ایک جھوٹ چل سکتا ہے۔ تھانے میں رتی برابر جھوٹ تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دے گا" — میں تھانیداروں کی طرح نہیں ایک ہمدرد کی طرح بول رہا تھا۔ میں نے کہا — "تمہارے اُوپر کوئی پردہ نہیں"

اُس کے آنسو نکل آتے۔ کہنے لگی — "ہمارا کیا پردہ ہے جی! ہمارے تو ستر پر بھی پردہ نہیں ہوتا۔ جن کے چوباروں کی دیواروں کے سائے میں ہم پل رہے ہیں وہی ہمارے ستر پردے کے مالک ہیں۔ ان کے لئے ہم لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو ہمیں روٹی دیتے ہیں ان کے جھوٹ اور کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لئے ہم خود ننگے ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں خدا کا خوف ہوتا یا میں غریب نہ ہوتی تو آپ مجھے یہ کہتے کچھ تو جھجکتے کہ تم نے اپنے خاوند کو قتل کرایا ہے۔"

"اگر سچ بولو گی تو تمہاری اتنی عزت کروں گا جتنی میرے دل میں نہ تمہارے چوہدریوں کی ہے نہ صوفی کی .... یہ جھوٹ ہے نا کہ حمیدا تمہیں چھیڑتا تھا؟"

"بالکل جھوٹ ہے جی!" — اُس نے کہا — "اُس نے مجھے کبھی نہیں چھیڑا تھا۔"

تمہیں چھیڑتا ہے اور مخدوم علی نے اسے تمہارے خاوند کے ہاتھ سے جوتے مرواتے تھے۔"

"ہاں جی، یہ جھوٹ ہے" — اُس نے کہا — "حمیدا اتنا جابر آدمی ہے کہ چوہدری اُس کے سامنے جوتے مارنے کا صرف نام لیتا تو حمیدا اُس کی کھوپڑی کھول دیتا۔"

میں نے بعد میں نمبردار وغیرہ اور گاؤں کے دو تین آدمیوں سے اس



عورت کے متعلق پوچھا تھا۔ سب نے ایک ہی جیسی رائے دی تھی۔ ان کے مطابق وہ شریف عورت نہیں تھی۔ فریب کار اور عیار تھی۔ اُس کا خاوند سیدھا سادا انہیں تھا۔ پولیس اور تھانے کی دہشت بڑے بڑے استادوں کا پسینہ نکال دیتی ہے اور تھانیدار ہوشیار اور عقل مند مل جاتے تو استادوں کی استادی ختم ہو جاتی ہے۔ اس عورت کی عیاری گاؤں میں چل جاتی تھی، تھانے میں نہیں۔ میں نے اس کے ساتھ رعب کے ساتھ تو بات ہی نہیں کی تھی۔

## وہ چھیڑتا رہا وہ ہنستی مچلتی رہی

مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کے خاوند کو کس نے قتل کیا ہے۔ معمہ یہ تھا کہ حمید موقعۂ واردات کے قریب موجود تھا۔ اس سے مجھے شک ہوتا تھا کہ قتل کے ساتھ حمید کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سوال کا جواب اس عورت کے پاس ہے۔ میں اُس پر مسلسل سوال پہ سوال کئے جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ اُسے جال میں لاتا جا رہا تھا۔ آپ کو صرف اپنے اہم سوال اور اُس کے جواب سُنا رہا ہوں۔

"تم نے یہ جھوٹا بیان کس کے کہنے پر دیا تھا کہ حمیدے نے تمہیں چھیڑا تھا، وغیرہ وغیرہ؟"

"چھوٹے چوہدری اور چھوٹے تھانیدار (نادر خان) نے الگ بٹھا کر مجھے یہ بیان دینے کو کہا تھا جو میں نے دے دیا تھا" — اُس نے کہا۔

"انہوں نے تمہیں کچھ دیا تھا؟"

"بیس روپے" — اُس نے جواب دیا — "بڑے چوہدری (مخدوم علی) نے گھر بُلا کر مجھے پانچ روپے دیئے اور کہا تھا کہ یہ بیان زبانی یاد کر لو۔ کچہری میں بھی تمہیں یہی بیان دینا پڑے گا۔"

"تم نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہارے خاوند کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"مجھے تو اب بھی یقین ہے کہ میرے خاوند کا قاتل حمید اہے"— اُس نے کہا — "چھوٹے چوہدری نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ مزارعے جو وہاں تھے وہ بھی یہی کہتے ہیں۔"

"تمہارے خاوند کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا — "ایسی دشمنی تو کسی کے بھی ساتھ نہیں تھی کہ کوئی اُسے قتل کر دیتا۔"

"جس کی بیوی تم جیسی ہو اُس کے کئی دشمن ہوتے ہیں"— میں نے کہا — "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں طعنہ نہیں دے رہا۔ مجھے سوچ کر بتاؤ کہ تمہاری وجہ سے اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟"

"نہ جی!"— اُس نے جواب دیا — "ایسی بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"وہ طبیعت کا کیسا تھا؟"— میں نے پوچھا — "سیدھا بُدھو سا ہوگا.... مجھے بالکل صحیح بات بتانا۔"

"بُدھو تو نہیں تھا"— اُس نے کہا — "سب کچھ جانتا بوجھتا تھا۔ رُعب والا آدمی تھا۔"

"تمہیں کبھی اُس نے بُری حرکتوں سے روکا نہیں تھا؟"

"وہ کبھی کبھی میری پٹائی بھی کر دیا کرتا تھا"— اُس نے جواب دیا۔

"یعنی اُسے معلوم تھا کہ تمہارا چال چلن کیسا ہے۔"

"وہ مجھ پر بد چلنی کا شک کرتا تھا"— اُس نے جواب دیا — "میں اُسے کہتی تھی کہ میں بد چلن نہیں۔ میں مردوں کو دھوکے میں رکھ کر اپنا مطلب پورا کرتی ہوں۔"

میں نے اُس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ خاوند اُسے مارتا پیٹتا تھا تو وہ کس کے متعلق شک کرتا تھا۔ اُس نے مجھے بتانا شروع کر دیا۔ اُس نے تین آدمیوں کے نام بتائے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے خاوند نے ان آدمیوں سے بھی لڑائی جھگڑا کیا ہوگا۔ اُس نے بتایا کہ اُسے معلوم نہیں۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے خاوند کی کسی کے ساتھ اپنی بیوی کے چال چلن کے سلسلے میں دشمنی ہوگی۔ وہ چونکہ میرے آگے ہتھیار ڈال چکی



تھی اس لئے اپنے چال چلن سے پردے اٹھاتی رہی۔

آخر میں اُس نے چار روز پہلے کا ایک واقعہ سُنایا۔ وہ مخدوم علی کے مویشیوں والے مکان میں مویشیوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔ اُس کا خاوند اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ مخدوم علی کا بیٹا جسے چھوٹا چوہدری کہتے تھے اپنی گھوڑی کو دیکھنے کے لئے آ گیا۔ اُس نے اس عورت کو اکیلے دیکھ کر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ عورت نے اُسے کہا کہ اس کا خاوند آنے والا ہے۔ اگر اُس نے دیکھ لیا تو وہ چھوٹے چوہدری کو کچھ نہ کہہ سکے گا اپنی بیوی کی پٹائی کر دے گا۔

چھوٹے چوہدری نے اُسے کہا کہ اس کا خاوند یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ عورت سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا اور وہ ہنستی رہی۔ اچانک اُس کا خاوند آ گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو چھوٹے چوہدری کے بازوؤں میں ہنستے اور مچلتے دیکھا اور جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ پہلے اُسے بیوی نے دیکھا۔ وہ گھبرا کر چھوٹے چوہدری کے بازوؤں سے آزاد ہونے لگی۔ پھر چھوٹے چوہدری نے اُسے دیکھا۔ اُس نے اس عورت کے خاوند سے کہا کہ کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو، باہر جاؤ اور کوئی کام کرو۔

خاوند نے کہا — "چھوٹے چوہدری! ہم تمہارے نوکر ہیں۔ اپنی عزت کے مالک ہم خود ہیں"— اُس نے اپنی بیوی کو گالی دے کر کہا — "چل نکل یہاں سے۔ تو بھی تو ایسی ہی ہے۔ میں گھر آ کے تیرے ساتھ بات کروں گا۔"

چھوٹا چوہدری اپنے مزارعوں اور نوکروں چاکروں کو زر خرید غلام سمجھتا تھا۔ اُس نے خاوند کو گالی دے کر کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ خاوند نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔ چھوٹے چوہدری نے اپنا بازو لمبا کر کے اُسے روکنا چاہا۔ خاوند نے اُس کے بازو پر بڑی زور سے ہاتھ مارا اور اُسے سخت غصیلی نظروں سے دیکھا۔ ایک ادنیٰ نوکر کا یہ جرم تھا کہ اُس نے اپنے آقا کے رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی اور اُس کے بازو پر غصے سے ہاتھ مارا تھا اور اُسے غصیلی نظروں سے دیکھا تھا۔

خاوند نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ وہ مجھے بتا نہ سکی کہ اُس کے آنے کے بعد اُس کے خاوند اور چھوٹے چوہدری میں کیا باتیں ہوئیں۔ خاوند گھر آیا تو اُس نے اپنی بیوی کو بہت پیٹا۔ دوسرے دن خاوند نے اپنی بیوی سے کہا —— "تُو نے چھوٹے چوہدری کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔ میں کہیں اور نوکری ڈھونڈ لوں گا۔"

"دو روز بعد میں باہر تھی" —— مقتول نوکر کی بیوی نے مجھے سُنایا —— "میں نے دیکھا کہ میرا خاوند ایک مزارعہ کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ میں دُور تھی اس لئے پوچھ نہ سکی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے اطلاع ملی کہ میرے خاوند کو حمید نے قتل کر دیا ہے۔"

# اس پر سکتہ طاری ہو گیا

اس عورت کا بیان ختم ہو گیا۔ اب میں نے اپنی مزید تسلّی بھی کرنی تھی لیکن اس کے بعد اس عورت سے مجھے کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ میں نے صرف اُس مزارعہ کا نام پوچھا جس کے ساتھ اُس نے اپنے خاوند کو جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے نام بتایا اور یہ بھی کہ وہ مزارعہ گواہوں میں شامل ہے اور باہر بیٹھا ہے۔ اس عورت کو برآمدے میں الگ بٹھا دیا اور اُس مزارعہ کو بُلایا۔

"جس روز تمہارے چوہدری کا یہ نوکر قتل ہُوا اس سے پہلے تم اسے کہاں لے جا رہے تھے؟" —— میں نے اُسے کہا —— "یہ سوچ کر بات کرنا کہ جھوٹ بولو گے تو تھانے سے باہر نہیں جا سکو گے اور پھر پانچ سات سال کے لئے جیل میں بند ہو جاؤ گے۔"

اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔

میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر زور سے ہلایا اور کہا —— "میں صرف وہ جواب سُنوں گا جو بالکل سچ ہو گا۔ تم نے تھانے میں جھوٹی گواہی دی



ہے لیکن میرے پاس تمہارے خلاف گواہ موجود ہیں۔"

اُس نے وہی حرکت کی جو دیہات کے غریب لوگ، مزارعے اور نوکر چاکر اپنے آقاؤں کے خلاف گواہی دینے سے پہلے کیا کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم انہی کا دیا کھاتے ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ ہم نے اُن کے خلاف بات کی ہے تو وہ ہمیں گاؤں سے نکال دیں گے، مروا دیں گے وغیرہ۔ خدا کے لئے ہم پر رحم کریں اور انہیں پتہ نہ چلنے دیں کہ ہم نے کوئی بات کی ہے۔

میں کہانی تو دیہاتی معاشرے کی سُنا رہا ہوں لیکن شہری معاشرے میں بھی یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ لوگ رشتے برادریوں اور دیگر تعلقات کو سامنے رکھ کر جھوٹ یا سچ بولتے ہیں۔ اگر کسی کے ساتھ کوئی ناراضگی ہے اور وہ خواہ بے گناہ ہی پکڑا گیا ہو تو اُس کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ "دنیاداری" کا خیال رکھتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی "چوہدری" کے یا اسمبلی کے کسی ممبر کے یا آج کل کسی کونسلر کے یا ایسے ہی کسی سرکردہ اور اثر و رسوخ والے آدمی کے محتاج یا زیرِ خوف ہوتے ہیں۔ وہ اُن کی مرضی اور مفاد کے مطابق جھوٹ یا سچ بولتے یا سب کچھ جانتے ہوئے چپ سادھ لیتے ہیں کہ انہیں تو کچھ بھی معلوم نہیں۔

دیہاتی معاشرے میں اونچی ذاتوں کے لوگ اور پیر و مُرشد لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھتے ہیں اور اُن کے کپڑے اتار کر اپنے گناہ پر ڈالے رکھتے ہیں۔ اس سے پولیس کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ آج کل تو پولیس بھی زیرِ اثر آ جاتی ہے۔ پانی کا رُخ دیکھ کر چلتی ہے۔ اس صورتِ حال میں مجرموں کو تحفظ ملتا ہے اور عوام کے لئے کوئی تحفظ نہیں رہتا۔ میں آپ کو جس دَور کی کہانی سُنا رہا ہوں اُس وقت کچھ چھوٹے اور بڑے تھانیدار ایسے تھے جو رشوت لے کر مجرموں کو بچا لیتے تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ انگریز اپنے قانون کے ساتھ کسی کو کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ رشوت لیتے یا دھاندلی کرتے جو پکڑا جاتا تھا اُس کی جان بخشی نہیں ہوتی تھی۔

میں چونکہ زیادہ عرصہ دیہاتی علاقوں میں رہا ہوں اس لئے مجھے یہ دشواری زیادہ پیش آتی تھی کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے مزارعے اور گاؤں کے دوسرے چھوٹے لوگ صحیح بات نہیں بتاتے تھے بلکہ پولیس کو گمراہ کرتے تھے۔ اب ایک اور کیس آگیا جس کی تفتیش میں مجھے مزارعوں پر بھروسہ کرنا تھا۔ میں نے اس مزارعہ سے جس کے ساتھ نوکر واردات کے روز جا رہا تھا پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا تو پہلے اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا پھر میری دھمکیوں سے اُس نے میری منت سماجت شروع کر دی کہ میں اُس کے چھوٹے چوہدری کو پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے کیا بیان دیا ہے۔

مختصر یہ کہ کچھ تسلیوں اور زیادہ تر دھمکیوں نے اس کی زبان کھول دی۔ اُس پر ایک تو میرا خوف سوار تھا، دوسرا خوف چھوٹے چوہدری کا تھا۔ وہ مخاطب مجھ سے تھا لیکن دیکھتا اِدھر اُدھر تھا۔

"مجھے چھوٹے چوہدری نے کہا تھا کہ بُشرے (مقتول نوکر) کو ساتھ لے آؤ، ضروری کام ہے" — اُس نے بتایا — "میں بُشرے کو ساتھ لے گیا۔"

"چھوٹا چوہدری کہاں تھا؟"

"اُس جگہ جہاں بُشرا قتل ہُوا ہے" — مزارعے نے جواب دیا۔

"تم جب بُشرے کو لے کر گئے تو چھوٹا چوہدری وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"کھڑا تھا" — اُس نے جواب دیا — "ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔"

"جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ نظر آتے تھے؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "وہ جگہ ذرا نیچے ہے۔"

"جب تم اور بُشرا چھوٹے چوہدری کے پاس گئے تو اُس نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے مجھے کہا تھا کہ تم چلے جاؤ" — اُس نے جواب دیا — "میں بُشرے کو اُس کے پاس چھوڑ کر کھیتوں میں چلا گیا۔ بس جی! میں اتنا ہی جانتا ہوں۔"



"تم کچھ اور بھی جانتے ہو" — میں نے کہا — "تم نے وہاں سے آتے ضرور پیچھے دیکھا ہوگا۔"

"دیکھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "دُور جا کر دیکھا تھا۔"

"کیا دیکھا تھا؟"

"چھوٹے چوہدری نے بُشرے کے پیٹ میں گھونسہ مارا یا لات ماری ہو گی، بُشرا بالکل دوہرا ہو گیا تھا اور اُس کے ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے ہوتے تھے" — اُس نے کہا — "میں دو تین قدم چلا اور پھر پیچھے دیکھا۔ چھوٹے چوہدری نے بُشرے کے پیٹ میں بڑی زور سے لات ماری۔ وہ گر پڑا۔ میں رُک نہیں سکتا تھا۔ چوہدری دیکھ لیتا تو مجھے بھی مارتا۔ میں چلا آیا اور وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔"

"وہاں حمید ابھی تھا؟"

"وہ تو کہیں بھی نظر نہیں آیا۔"

"پھر کیا ہُوا؟" — میں نے کہا — "اب باقی جو کچھ ہُوا خود سُنا دو۔"

"تھوڑی دیر بعد چھوٹا چوہدری اُوپر آیا" — مزارعے نے بتایا —

"وہ ہم سب کو بلا رہا تھا۔ ہم سب دوڑے گئے۔ چوہدری کہہ رہا تھا کہ وہ دیکھو، حمید بُشرے کو قتل کر گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ تیس پینتیس قدم دُور حمید کھڑا اِدھر دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے چوہدری نے ہمیں اُس کے پیچھے دوڑا دیا۔ وہ قدموں کا تیز تھا، نکل گیا۔ ہم واپس آ گئے۔ چھوٹے چوہدری نے ہمیں گالیاں دیں کہ قاتل کو ہم نہ پکڑ سکے۔ چھوٹا چوہدری ہمیں بُشرے کی لاش کے قریب چھوڑ کر چلا گیا۔ بہت دیر بعد پولیس آ گئی .... چھوٹے تھانیدار صاحب تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کا ایک حوالدار اور تین سپاہی تھے۔ ہمیں وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ پھر ہم سے چارپائی منگوائی گئی۔ اس پر ہم نے لاش کو ڈالا اور ہسپتال لے گئے....

"چھوٹے تھانیدار صاحب نے اور چھوٹے چوہدری نے ہمیں چوہدری کے گھر لا کر کہا کہ ہم وہ بیان لکھوائیں جو وہ ہمیں بتائیں گے۔"

مزارعے نے وہ بیان مجھے سنایا جو ان سب گواہوں کو نادر خان

اور مخدوم علی کے بیٹے نے بتایا تھا۔ انہیں ڈرایا گیا اور پچیس پچیس روپے بھی دیئے گئے تھے۔ آج کی نسل تصور میں نہیں لا سکتی کہ اُس زمانے میں پچیس روپے کتنی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ پچیس روپے کلرک کی پورے مہینے کی تنخواہ ہوتی تھی۔

## اے۔ ایس۔ آئی لائن حاضر

مَیں نے نادر خان کو بلانے کی بجائے ایک ہندو ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ مخدوم علی کے بڑے بیٹے کو تھانے لے آؤ۔ مجھے احساس تھا کہ چھوٹا چوہدری اپنے باپ کے پوسٹمارٹم اور اس کے بعد ماتم اور کفن دفن میں مصروف تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ جس حال میں ہو اُسے تھانے لے آؤ۔ اگر چوہدراہٹ کے نشے میں گڑبڑ کرے تو اُسے گھسیٹ کر لے آؤ۔

مَیں اب ہر اُس آدمی سے الگ الگ پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا جسے بُشرے کے قتل کا گواہ بنایا گیا تھا۔ نادر خان میرے پاس آیا۔ وہ میری فطرت سے واقف نہیں تھا۔ مجھے نصیحتیں کرنے لگا کہ میں اس کیس میں زیادہ سَر نہ کھپاؤں۔ چوہدری مخدوم اور صوفی بڑے اچھے آدمی تھے۔ چوہدری کا خاندان بڑا معزز ہے۔ یہ سب حمیدے کا چکر ہے، وغیرہ۔ وغیرہ۔ آپ یہاں ابھی ابھی آئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی سیاست کچھ اور ہے۔

مَیں اُس کے سامنے بُدھو بن گیا بلکہ میں نے اس طرح کے ردِّ عمل کا اظہار کیا جیسے میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔ اُسے شک ہو گیا کہ یہ کوئی اناڑی آ گیا ہے۔ اُس نے رازداری سے کہا کہ یہ ہماری خاطر تواضع کرنے والے لوگ ہیں۔ میں نے احمقوں کی طرح مُنہ کھول کر کہا —— "اچھا! یہ تو اور اچھا ہے۔ میں نے چھوٹے چوہدری کو بلوایا ہے۔ تم اس سے بات کر لینا۔"

"مقتول کی بیوی اور یہ مزارعہ آپ کو کیا بتا گئے ہیں؟" —— اُس



نے پوچھا۔

"وہی جو انہوں نے تمہیں بیان دیا تھا" —— میں نے کہا —— "بُشرے کا قاتل بھی حمیدا ہی ہے۔ میں کیس اسی پر ختم کر رہا ہوں۔"

اُسے تسلی دلاسہ دے کر باہر نکالا اور دروازہ بند کر کے میں نے ٹیلیفون اُٹھا لیا۔ ایکسچینج سے کہا کہ مجھے ڈی۔ ایس۔ پی سے فوراً ملوا دے۔ ہیڈ کوارٹر تیس بتیس میل دُور تھا۔ کال جلدی مل گئی۔ ڈی۔ ایس۔ پی مل گیا۔ وہ انگریز تھا، این۔ ڈی۔ بہل۔ میں نے اُسے یہ کیس اختصار سے سنایا۔ کاغذات کی نقلیں تو اُسے بھجوا دی گئی تھیں۔ ایک ہی بار تین قتل بڑی سنگین واردات تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ ملزم کو ہتھکڑی کے بغیر حوالات سے نکال لیا اور وہ بھاگ گیا اور اُس نے دو اور آدمیوں کو قتل کر دیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے میری اس دیانتداری کو سراہا کہ میں جس غلطی کو چھپا سکتا تھا وہ میں نے اُسے بتا دی۔

اُسے دراصل میں نادر خان کے متعلق بتانا چاہتا تھا کہ اس اے۔ ایس۔ آئی نے اصل قاتل سے رشوت لی اور ایک بے گناہ کو گرفتار کر کے اُسے زدوکوب کیا کہ وہ اس کی مرضی کا اقبالی بیان دے، اور اُس نے غریب اور معاشرتی لحاظ سے کمزور آدمیوں کو ڈرا دھمکا کر موقعہ کا گواہ بنایا، اور مقتول کی بیوی سے بھی اپنی مرضی کے بیان لئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس بے گناہ کو پکڑا گیا تھا اُس نے مشتعل ہو کر اُن دو سرکردہ افراد کو قتل کر دیا جن کے متعلق اُسے معلوم تھا کہ انہوں نے اسے بے گناہ پکڑوا دیا ہے۔

مَیں نے نادر خان کے جُرم کی تفصیل سُنا کر ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا کہ مَیں کاغذی کارروائی بعد میں کر لوں گا، میں اسے فوری طور پر لائن حاضر کرانا چاہتا ہوں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسی وقت زبانی حکم دے دیا کہ اے۔ ایس۔ آئی نادر خان کو فوراً لائنز میں بھیج دو۔

میں نے جب نادر خان کو یہ حکم سنایا تو وہ بہت سٹپٹایا۔ یہ الگ قصّہ ہے کہ میں نے اُسے کس طرح رخصت کیا۔ اُسے اُسی وقت تھانے سے چلے جانے کو کہا۔

میں نے باقی گواہوں کو جو نادر خان اور چھوٹے چوہدری نے بناتے تھے، باری باری اپنے سامنے بٹھایا اور اُن سے ایک ہی جیسے سوال پوچھے۔ ہر ایک نے ایک ہی جیسے جواب دیئے۔ ان سے بُشرے کی بیوی اور مزارعہ کے بیانات کی تصدیق ہوگئی۔ ان سب نے بتایا کہ چھوٹے چوہدری کو کھیتوں میں اُس طرف جاتے دیکھا تھا جہاں انہوں نے بُشرے کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس مزارعہ نے جو مجھے بیان دے چکا تھا بُشرے کو بُلایا... اور اُسے چھوٹے چوہدری کے پاس چھوڑ کر جب وہ واپس آیا تو اُس نے انہیں بتایا کہ بُشرے کی پٹائی ہو رہی ہے۔ انہیں جب چھوٹے چوہدری نے حمید کو پکڑنے کے لئے بُلایا تو حمید دُور کھڑا تھا۔ انہوں نے فاصلہ پچیس سے پینتیس قدم تک بتایا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ بُشرے کی بیوی کیسی عورت ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس کا کوئی دین مذہب نہیں۔ چاہے تو سارے گاؤں کے سامنے بڑے چوہدری کی بے عزّتی کر دے اور چاہے تو کسی چوہڑے چمار سے آشنائی کر لے۔ اس کی خوبصورتی اور بچوں جیسی حرکتیں دیکھ کر بعض مرد اسے ڈھیلی جڑ سمجھ لیتے ہیں کہ ذرا سی کھینچو تو زمین سے نکل آئے گی لیکن یہ زمین میں اتنی دُور گئی ہوتی ہے کہ ہلتی رہتی ہے باہر نہیں نکلتی۔

## "مجھے کسی چوہدری اور پیر کے مرنے کا افسوس نہیں"

چھوٹا چوہدری بڑی شاندار گھوڑی پر آیا۔ وہ افسوس میں تھا اور رعب میں بھی۔ میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے کھڑکی میں سے نظر آ رہا تھا۔ ہندو



کانسٹیبل جو اُسے ساتھ لایا تھا وہ اُسے کہہ رہا تھا کہ دفتر میں چلو لیکن وہ نادر خان کی پوچھ رہا تھا۔ اندر نہیں آتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے آکر بتایا کہ وہ اندر نہیں آتا، کہتا ہے پہلے نادر خان سے ملوں گا۔ میں باہر نکلا۔

"اِدھر آؤ چوہدری!" — وہ میرے قریب آیا تو میں نے اُسے کہا — "نادر خان تمہیں نہیں مل سکے گا۔ وہ جا رہا ہے۔ تم نے اُسے جو رقم دی تھی وہ سب ضائع ہوگئی ہے۔ اسی رقم نے اُسے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اُسے لائن حاضر کر دیا گیا ہے۔ اب میرے ساتھ بات کرو۔ اندر آجاؤ۔"

اُس کی چوہدراہٹ ختم ہوگئی۔ مجھے حیرت اور گھبراہٹ سے دیکھتا وہ میرے دفتر میں آگیا۔ میں نے اُسے کرسی پر بٹھایا۔

"چوہدری!" — میں نے اُسے کہا — "کیا اب بھی تم خدا کے غضب کو نہیں مانو گے؟ تم نے ایک بے گناہ کو قتل کیا اور ایک بے گناہ کو گرفتار کرایا اور اگلے ہی روز تمہارا باپ مارا گیا اور اس سے اگلے روز تم قتل جیسے ظالمانہ گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے پکڑے گئے۔ پھانسی چڑھنے سے پہلے تمہاری اور تمہارے خاندان کی جو بے عزّتی ہوگی اُس پر غور کرو۔ ایک غریب اور مزدور عورت عدالت میں کھڑی ہو کر کہے گی کہ اس چوہدری نے میری عزّت پر ہاتھ ڈالا تھا اور میرے خاوند نے اسے روکا تو اس نے میرے خاوند کو قتل کر دیا۔"

"میں نے کسے قتل کیا ہے؟" — اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا — "یہ عورت بڑی بدمعاش ہے۔ قاتل حمید ہے جو مانا ہوا غنڈہ بدمعاش ہے۔"

"چوہدری!" — میں نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "نادر خان اس تھانے سے چلا گیا ہے۔ تمہارے ساتھ مل کر اُس نے جو جرم کیا ہے اس کی اُسے پوری سزا ملے گی۔ گواہ باہر بیٹھے ہیں۔ اب تم گھر نہیں جاسکو گے۔"

"یہ ظلم نہ کریں حضور!" — اُس نے کہا — "میرے والد صاحب کا جنازہ تیار ہے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے گھر جانے دیں۔"

"کسی چوہدری کے مرنے کا اور صوفی جیسے کسی پیر کے مرنے کا مجھے کوئی افسوس نہیں" — میں نے کہا — "وہ جو مر گئے ہیں تمہارے بغیر بھی دفن ہو جائیں گے .... مجھے صرف یہ بتا دو کہ اقبالِ جرم کرو گے؟"

"نہ کروں تو کیا ہوگا؟"

"نہ کرو" — میں نے کہا — "مقدمہ تیار ہے۔ گواہ موجود ہیں۔ تمہارا جرم ثابت ہے۔ پھانسی کا تختہ تیار ہے۔ اگر اقبالِ جرم کر لو گے تو شاید تمہیں پھانسی سے بچا لوں۔"

"اگر آپ مجھے بالکل ہی بچا لیں تو کیا لیں گے؟" — اُس نے کہا — "جتنی رقم منہ سے کہیں نقد حاضر ہو گی۔ زیورات مانگیں" — اُس نے ذرا آگے کو ہو کر کہا — "میرے گاؤں میں چلیں۔ کسی کی طرف اشارہ کر دیں۔ وہ آپ کی ہو گی۔"

"لیکن مجھے جب تک پتہ نہیں چلے گا کہ تم نے بُشرے کو کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے میں تمہیں کیسے بچا سکتا ہوں" — میں نے کہا — "میں پوری واردات سُنوں گا تو میں سوچ سکوں گا کہ ان گواہوں میں سے کسے گول کر دوں اور کسے رکھوں۔"

"اِن لوگوں کا آپ فکر نہ کریں" — اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا — "آپ جو کہیں گے میں اِن سے کہلوا دوں گا۔"

"اب مجھے اس طرح ہر ایک بات بتاؤ جس طرح مریض ڈاکٹر سے کچھ نہیں چھپاتا" — میں نے کہا۔

وہ کچھ جھجکا۔ کچھ ڈرا۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ جھوٹے وعدے کئے۔ اپنی استادی چلائی اور اُسے دوست بنا کر جال میں پھانس لیا۔ یہ میرا "طریقہ واردات" تھا۔

## تم اپنی بیوی میرے حوالے کردو

اُس نے اپنے جُرم کی روئیداد شروع کر دی۔ میں سوال اور جرح



کرتا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اسے داد بھی دیتا رہا۔ وہ اس طرح بولنے لگا جیسے ماں اپنے بچے کو کہانی سُنا رہی ہو۔ یہ کہانی یوں بنی کہ حمید چونکہ خود سَر تھا اور پھر اُس نے صوفی کی مخالفت شروع کر دی تھی اس لئے یہ چوہدری اُس کے خلاف تھے۔ دیہاتی معاشرے میں شروع سے یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ گاؤں میں جو اپنی مرضی کرتا اور گاؤں کے چوہدریوں کی بادشاہی قبول نہیں کرتا اُسے در پردہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حمید کو ایک مسافر خدا کا مرید بنا گیا تھا، اس لئے اُس نے صوفی کی مریدی ترک کر دی۔ اُس کا دوسرا قصور یہ تھا کہ اُس نے اپنی منگیتر کو نہیں چھوڑا تھا۔ چوہدری مخدوم علی اس لڑکی کا رشتہ اپنے کسی عزیز کو دلانا چاہتا تھا۔ صوفی بھی یہی چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی حمید سے نہ ہو۔

"اس کی وجہ مجھے معلوم ہے کہ صوفی کیوں اس لڑکی کا رشتہ کسی اور کو دلانا چاہتا تھا" — میں نے کہا — "لڑکی اُس کی مریدنی تھی۔ ایسی جوان اور خوبصورت مریدنی سے کوئی پیر دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔ حمید اُس کا باقاعدہ مرید نہیں تھا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں" — چھوٹے چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا — "اس لڑکی کے ساتھ صوفی کے تعلقات ایسے ویسے نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ لڑکی صوفی کی بیٹی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو چوہدری؟"

"اس لڑکی کی ماں جوانی سے صوفی کی مریدنی تھی" — چھوٹے چوہدری نے کہا — "وہ اولاد کے لئے صوفی کے پاس جایا کرتی تھی۔ صوفی سے اُسے یہ لڑکی حاصل ہوئی۔ آپ نے صوفی کو زندہ نہیں دیکھا۔ آپ نے لڑکی کو بھی نہیں دیکھا۔ لڑکی کا ناک نقشہ بالکل صوفی جیسا ہے۔ ہونٹ اور دانت تو ہیں ہی صوفی کے۔ پھر یہ راز کسی طرح کھُل گیا تھا کہ یہ لڑکی صوفی کی بیٹی ہے۔ صوفی کی دلچسپی اس لڑکی کے ساتھ صرف یہ تھی کہ یہ اُس کی بیٹی ہے۔"

حمید نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ لڑکی حمید کو چاہتی تھی۔

صوفی نے، مخدوم علی اور اس کے اس بیٹے چھوٹے چوہدری نے لڑکی کو حمید کے خلاف کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دو تین عورتوں کو استعمال کیا جو لڑکی کے کانوں میں یہ ڈالتی رہیں کہ حمید بدمعاش آدمی ہے اور اس کے تعلقات دوسری عورتوں کے ساتھ ہیں۔ یہ سکیم کامیاب رہی۔ لڑکی حمید سے بدظن ہو گئی۔ ایک سال بعد وہ اپنے گھر گئی اور واپس نہ آئی۔ صوفی نے لڑکی کی ماں سے کہا تھا کہ وہ لڑکی کو حمید کے گھر نہ بھیجے اور طلاق لے لے۔ حمید نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ مخدوم علی، صوفی اور چھوٹے چوہدری نے بھی اُسے کہا کہ وہ لڑکی کو بسا لے یا طلاق دے دے۔ حمید نے تینوں کو بہت بُری سنائیں۔

ان لوگوں نے حمید کو قتل کرانے کے منصوبے بھی بنائے لیکن حمید نے ایسے لوگوں کو دوست بنا لیا تھا جو انتقام لینے کی ہمت رکھتے تھے۔ اتفاق سے یہ واقعہ ہو گیا کہ چھوٹے چوہدری نے مویشیوں والے مکان میں بُشرے کی بیوی پر دست درازی کی۔ اس عورت کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند آرہا ہوگا۔ وہ آ ہی گیا اور اُس کی عزت اور بے بسی پر غیرت غالب آگئی۔ اُس نے چھوٹے چوہدری کی بے عزتی کر دی۔

چوہدری اپنے نوکر کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے دوسرے تیسرے روز بُشرے کو کھیتوں میں بلایا۔ وہ بُشرے کو دو چار تھپڑ مار کر ڈرانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اس نوکر کو اُس کے گھر جا کر بھی مار پیٹ سکتا تھا لیکن ہُوا یوں کہ چوہدری کھیتوں میں گیا تو اُسے اچانک یاد آگیا کہ بُشرے نے اُس کے آگے گستاخی کی تھی۔ اُس نے اُسی وقت ایک مزارعے کو بھیج کر بُشرے کو بُلا لیا۔ اُس کے آنے سے پہلے چوہدری کھیتوں سے پیچھے چلا گیا تھا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ بُشرا سب مزارعوں کے سامنے اُس کی بے عزتی کر دے گا۔

بُشرا آیا تو چھوٹے چوہدری نے اُسے گالیاں دیں اور کہا ــــ "میں تمہارا وہ حال کر دوں گا کہ اپنی بیوی کو تم خود میرے پاس لاؤ گے"۔



"منظور ہے چوہدری!" ــــ بُشرے نے اُسے کہا ــــ "میں اپنی بیوی تمہارے پاس لے آتا ہوں تم اپنی بیوی میرے حوالے کر دینا"۔

چھوٹے چوہدری کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے۔ اُس نے بُشرے کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور گالی دے کر کہا ــــ "تم میری جوتیوں میں روٹی کھانے والے یہ بکواس کرتے ہو؟"

بُشرے نے ویسا ہی تھپڑ چوہدری کے مُنہ پر جڑ دیا۔ چھوٹے چوہدری کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے بُشرے کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ چھوٹے چوہدری نے دوسری لات اُس کے پہلو میں ماری۔ بُشرا گر پڑا۔ چھوٹا چوہدری تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ قریب ایک پتھر پڑا تھا۔ اُس نے پتھر اُٹھا کر بُشرے کے سر پر مارا۔ اس سے اُس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہُوا۔ ایک غلام نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا تھا۔ چھوٹے چوہدری نے وہی پتھر پھر اُٹھایا اور بُشرے کے سر پر مارا، پھر تیسری بار اور زیادہ طاقت سے پتھر اُس کے سر پر ہی مارا۔

"وہ تو باؤلا کُتا تھا" ــــ چھوٹے چوہدری نے مجھے اپنے جُرم کی کہانی سُناتے ہوئے کہا ــــ "ہم ان لوگوں کو انسان نہیں سمجھا کرتے۔ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی یہی کرتے۔ بُشرے جیسے کُتے کو اسی طرح ہلاک کرتے"۔

وہ جب بُشرے کو باؤلا کُتا سمجھ کر ہلاک کر چکا تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے حمید کھڑا نظر آیا۔ چھوٹے چوہدری کے شیطان دماغ نے فوراً اس شکار کو بھی مارنے کی ترکیب سوچ لی۔ اُسے ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ حمید اُس کے جُرم کا عینی شاہد ہے اور اس کے ساتھ ہی اُس نے حمید کو خود سَری کا مزہ چکھانے کا طریقہ سوچ لیا۔ وہ دوڑ کر اُوپر گیا اور اپنے مزارعوں کو آوازیں دے کر کہا کہ وہ دیکھو حمید نے بُشرے کو قتل کر دیا ہے۔ مزارعے دوڑے آئے اور چھوٹے چوہدری کے کہنے پر حمید کے پیچھے دوڑے لیکن وہ بھاگ نکلا۔

تھانے رپورٹ دینے کے لئے چھوٹا چوہدری خود آیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نادر خان اُس کا دوست تھا۔ چھوٹا چوہدری اُسے شراب بھی پلایا کرتا تھا۔ اُس

نے تھانے آکر نادر خان کو بتایا کہ اُس نے کیا کیا ہے اور حمید کے ساتھ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے نادر خان کو دو ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ رقم آج کے حساب سے بیس ہزار سمجھ لیں۔ نادر خان نے موقعۂ واردات پر جا کر لاش اٹھوانے اور پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے کا انتظام کیا اور مزارعوں کو الگ کر کے بتایا کہ وہ کیا بیان دیں۔ اُس نے کاغذوں میں لکھا تھا کہ لاش کے قریب حمید کے کھُرے پائے گئے۔

رات کو ان دونوں نے بُشرے کی بیوی کو بھی بیان بتاتے اور اُسے کہا کہ وہ یہ بیان زبانی یاد کر لے۔ رات کو ہی نادر خان نے حمید کو گھر سے پکڑ لیا۔ چھوٹے چوہدری نے اپنے باپ مخدوم علی کو بتایا کہ بُشرے نے اُس کی بے عزّتی کی تھی اس لئے اس نے بُشرے کو جان سے مار دیا ہے۔ مخدوم علی کو بیٹے نے جب یہ بتایا کہ اُس نے حمید کو پکڑوا دیا ہے تو مخدوم علی بہت خوش ہُوا۔ اُس نے کہا —— "اب دیکھوں گا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق کس طرح نہیں دیتا۔"

مخدوم علی نے نادر خان سے کہا کہ جس روز حمید کو عمر قید یا سزائے موت سُنائی جائے گی اُس روز وہ نادر خان کو ایک ہزار روپیہ مزید انعام دے گا۔

اتنے میں مَیں پہنچ گیا۔ پھر جو کچھ ہُوا وہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں چھوٹے چوہدری کا بیان سُن کر مَیں اُسے اگلے روز مجسٹریٹ کے پاس لے گیا تا کہ مجسٹریٹ زیرِ دفعہ ۱۶۴ بیان اقبالی قلمبند کر لے۔ میں اُسے مجسٹریٹ کے پاس چھوڑ آیا۔ اقبالی بیان زبردستی نہیں لیا جا سکتا۔ مجسٹریٹ نے اُسے بتایا کہ وہ بیان دینے یا نہ دینے میں آزاد ہے۔ ملزم کو مجسٹریٹ سوچنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ چھوٹے چوہدری نے اقبالی بیان قلمبند کرانے سے انکار کر دیا۔ قانون کے مطابق اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

مجھے اس کا کوئی نقصان نہ ہُوا۔ میں مقدمہ تیار کرنا اور جُرم ثابت کرنا جانتا تھا۔ جس طرح اُس نے حمید کو بُشرے کا قاتل کہہ کر اپنے مزارعوں کو موقعہ کے



گواہ بنا لیا تھا اسی طرح میں نے اُس کے مزارعوں کو موقعہ کا گواہ بنا کر اُس کے خلاف قتل کے مقدمے کے کیس کو پکّا کر لیا۔

وہ امیر کبیر زمیندار تھا۔ عدالت میں وہ بڑا قابل ہندو وکیل لایا تھا مگر یہ وکیل چھوٹے چوہدری کو سزائے عمر قید (عبور دریائے شور یعنی کالا پانی) سے بچا نہ سکا۔ ہائی کورٹ میں اپیل بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

حمید کا بچنا ناممکن تھا۔ اُس نے دو آدمیوں کو قتل کیا تھا اُسے سزائے موت دی گئی۔

اے۔ ایس۔ آئی نادر خان کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ مجھے میرے محکمے نے اس الزام سے بری کر دیا کہ میری بے احتیاطی کی وجہ سے حوالات سے ایک ملزم بھاگ گیا اور اُس نے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔

# ماں بیٹی اور بیٹا

واردات جو آپ کو سُنانے لگا ہوں اس کی تفتیش میں میرا کوئی کمال شامل نہیں۔ واقعات اپنے آپ رُونما ہوتے رہے۔ میری پوزیشن ریلوے سٹیشن پر کانٹے بدلنے والے کی مانند تھی۔ اسے اُس لائن پر چڑھا دیا، اُسے اِس لائن پر چڑھا دیا۔ یہ روزمرّہ زندگی کا ایک ڈرامائی واقعہ ہے جو فلمی کہانی کی طرح لگتا ہے۔ ایسے واقعات کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ یہ چار دیواری کی دنیا کا ایک ڈرامہ ہے۔

میں حسبِ معمول اشخاص اور مقامات کے اصل نام نہیں لکھوں گا۔ میں اصل نام احتیاطاً نہیں لکھا کرتا۔ اس کہانی میں تو مجھے زیادہ احتیاط کرنی پڑے گی۔

میں ایک قصبے کے تھانے کا انچارج تھا۔ یہ قصبہ تحصیل کا مرکز تھا۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے شہر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اردگرد کے بہت سے دیہات بھی اسی تھانے کے تحت آتے تھے۔ اُس زمانے میں جرائم آج کل کی طرح اتنے زیادہ نہیں ہوتے تھے اس لئے ایک ایک تھانے کے تحت بہت وسیع علاقہ آتا تھا۔ شہر کے مضافات میں ایک بڑا گاؤں تھا جس کا شہر سے فاصلہ پانچ چھ میل کے درمیان تھا۔ وہاں کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھانے میں آیا۔ کہنے لگا کہ اُس کا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ سال اور تین چار مہینے تھی، چار دنوں سے لاپتہ ہے۔

اگر بچہ یا نوجوان لڑکی لاپتہ ہو جاتے تو پہلا شک اغوا کا ہوتا ہے۔



نوجوان لڑکی کے معاملے میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ پھر بھی اغوا کا امکان ہوتا ہے لیکن اٹھارہ اُنیس سال کے جوان آدمی کی گمشدگی کچھ اور سوال پیدا کرتی ہے۔ ایسے جوان آدمی کو اغوا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ کہیں قتل ہو سکتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکے جوانی کے جوش میں گھروں سے بھاگ جاتے ہیں یا کسی لڑکی کو بھگا لے جاتے ہیں اور کچھ دن ذلیل و خوار ہو کر واپس آجاتے ہیں۔

"گھر سے زیورات یا پیسے غائب ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "یہ میں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔"

"گاؤں کی کوئی لڑکی لاپتہ ہے؟"

"میرا خیال ہے کوئی لڑکی غائب نہیں" — اُس نے کہا — "اگر غائب ہوتی تو پتہ چل جاتا۔ گاؤں میں ایسی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔"

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ خود کوئی راستے دے سکتا ہے کہ اُس کا بیٹا کہاں جا سکتا ہے؟ اُس نے کہا کہ وہ بہت سوچ چکا ہے۔ اُس کے دوستوں سے بھی پوچھ چکا ہے۔ شہر میں بھی آیا تھا۔ یہاں اُس کے ایک دوست کا سراغ ملا تھا۔ اُسے بھی کچھ پتہ نہیں۔

"کوئی ایسی وجہ ہو سکتی ہے کہ کسی نے اُسے قتل کر دیا ہو؟"

"اب مجھے کچھ ایسا ہی شک ہونے لگا ہے" — اُس نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کے ساتھ دشمنی تھی" — میں نے کہا — "اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ دشمنی کس کے ساتھ تھی اور کیوں تھی تو میں آپ کے بیٹے کو زندہ یا مُردہ تلاش کر سکتا ہوں، لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ قتل ہی ہوا ہوگا ٹھیک نہیں۔ اگر آپ کو اپنا بیٹا چاہیے تو مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ اُس کے چال چلن کے متعلق، اُس کی دوستی اور دشمنی کے متعلق اور گھر میں اُس کا جو رویّہ اور سلوک رہتا تھا وہ بھی تفصیل سے بتائیں۔"

عام طور پر باپ اپنی اولاد کو نیک اور شریف بتایا کرتے ہیں۔ لڑکی اپنی مرضی سے چلی جاتے تو بھی کہتے ہیں کہ اُسے ورغلا کر اغوا کیا گیا ہے۔ لڑکا آوارہ اور بدمعاش ہو تو کہتے ہیں کہ بےچارہ چپ چاپ سا لڑکا تھا۔ اُس کے دوستوں نے اُسے چرس ورس پلا دی ہو گی، لیکن یہ باپ کچھ اور قسم کا نکلا۔ وہ معمولی سا پڑھا لکھا تھا۔ گاؤں میں اُس کی زمین خاصی تھی جس پر مزارعے کام کرتے تھے۔ یہ شخص شکل وصورت، قد، ڈیل ڈول اور لباس سے بھی اچھے ذوق اور عقل والا لگتا تھا۔ کہنے لگا کہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو تو میں تمام باتیں بتا دوں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ میرے وقت کی پرواہ نہ کرے۔ یہی میری ڈیوٹی ہے، اور مجھے جتنی زیادہ باتیں بتائی جائیں گی میرا کام اتنا ہی آسان ہو گا۔

"یہ لڑکا میری پہلی بیوی سے ہے" — اُس نے کہا — "یہ ابھی ایک سال کا تھا جب میں نے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"سُنا ہے شہر میں ہے" — اُس نے کہا — "اُس نے طلاق کے بعد فوراً شادی کر لی تھی۔"

"آپ اُس کے دوسرے خاوند کو جانتے ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "شہر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ کبھی آتا ہوں تو جو کام ہو وہ کر کے چلا جاتا ہوں۔ میں اُس فطرت کا آدمی نہیں ہوں کہ بیوی کو طلاق دے کر کوشش کرتا کہ وہ بدنام ہو جائے اور کوئی اُس کے ساتھ شادی نہ کرے۔ وہ میرے گاؤں سے آٹھ میل دُور گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میں نے اُسے طلاق دی اور دل سے اُتار دیا۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی زبان سے اُس کے خلاف بات نہیں کی۔ میں یہ گناہ کرنے سے ڈرتا تھا۔ اُس کی عمر ابھی سترہ سال تھی۔ اگر میں اُسے بدنام کر دیتا تو اُس کی ساری زندگی تباہ ہو جاتی۔ لوگ



وجہ پوچھتے تھے۔ میں کہتا تھا کہ آپ لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں۔ میری اُس کے ساتھ نہیں بن سکی....

"بعض لوگ جن میں عورتیں زیادہ تھیں، مجھے خوش کرنے کے لئے کہتے تھے کہ لڑکی آوارہ اور بدمعاش تھی لیکن میں نے سب سے کہا کہ وہ آوارہ نہیں تھی بدمعاش بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے خاندان اور برادری کے لوگوں پر غصّہ بھی جھاڑا تھا کہ وہ ایسی گھٹیا باتیں نہ کریں .... پھر ایک سال کے اندر میں نے دوسری شادی کر لی اور شاید اتنے ہی عرصے میں اُس کی بھی شادی ہو گئی۔ مجھے اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ اُس کی شادی شہر میں ہوتی ہے۔"

## نوبت طلاق تک پہنچی

اُس نے بڑی لمبی بات شروع کر دی تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماں نے اپنے بیٹے کو اغوا کرا لیا ہو، یا ماں بیٹے کی ملاقات ہوتی رہی ہو اور بیٹا اپنی ماں کے پاس چلا گیا ہو لیکن ایسا امکان نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُس نے بتایا تھا کہ جب اُس کی ماں کو طلاق دی گئی اُس وقت بچّہ ایک سال کا تھا۔ اس عمر کے بچّے کو بڑے ہو کر کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بہرحال میری ضرورت کچھ اور تھی اور اس شخص نے بڑی لمبی کہانی شروع کر دی تھی۔ میں اُسے روک سکتا تھا لیکن مجھ میں انسانیت بھی تھی اور میں بھی باپ تھا۔ ان جذبات کے علاوہ یہ آدمی تھوڑی سی دیر میں ہی مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ اُس کے انداز اور رجحان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صاف گو اور نیک سیرت ہے اور وہ اپنے گمشدہ بیٹے کی بےجا تعریف نہیں کرے گا۔ اپنی پہلی بیوی کے متعلق اُس نے جو رویّہ اختیار کیا تھا یہ کوئی کردار والا ہی کر سکتا ہے ورنہ رواج یہ ہے کہ مظلوم خواہ بیوی ہی ہو اور خاوند لوفر لفنگا ہو، اگر

طلاق ہو جاتی ہے تو بیوی کو اتنا رُسوا کیا جاتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

"یہاں مجھے یہ شک ہونے لگا ہے کہ آپ کی پہلی بیوی نے لڑکے کو اغوا کرایا ہے"— میں نے کہا۔

"اس شک پر لکیر پھیر دیں"— اُس نے کہا— "بچّہ اُس وقت ایک سال کا تھا۔ وہ میری دوسری بیوی کو اپنی ماں سمجھتا ہے۔ گاؤں میں کوئی راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ چھ سات سال کی عمر میں بچے نے مجھ سے کہا تھا کہ ابّو، لوگ کہتے ہیں کہ تمہاری ماں کوئی اور تھی۔ میں نے ہنس کر کہا تھا کہ لوگ تمہیں چھیڑتے ہیں۔ ماں ایک ہی ہُوا کرتی ہے اور تمہاری ماں یہ ہے۔"

"کیا آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آپ کی دوسری بیوی نے ہی بچے کو یہ تاثر دیا ہو کہ وہ اُس کی ماں نہیں اور اُس کی ماں کہیں اور ہے؟"— میں نے کہا— "آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں سوتیلی ماں کو بڑا ہی خطرناک کردار سمجھا جاتا ہے۔ یہ غلط بھی نہیں۔"

"میں گھر رہتا ہوں"— اُس نے کہا— "میں نے ذاتی نظر رکھی کہ میری دوسری بیوی میرے بچے کے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک نہ کرے۔ بات یہ ہے صاحب! وہ میری غلطی تھی کہ اپنی ٹکر کے خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اُس کا دماغ امیری نے خراب کر رکھا تھا۔ میں نے دوسری شادی اپنے سے نیچے گھرانے میں کی ہے۔ بیوی کو جو اُس وقت اٹھارہ سال کی کنواری لڑکی تھی، میں نے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہنسی خوشی، اطمینان اور پیار محبت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو میرے بیٹے کی سگی ماں بن کر دکھائے گی اور اُسے پتہ نہیں چلنے دے گی کہ اس کی ماں کوئی اور ہے....

"اس لڑکی نے دیکھ لیا تھا کہ میں سترہ سال کی عمر کی ایک بڑی خوبصورت لڑکی کو طلاق دے چکا ہوں اور اسے بھی طلاق دے سکتا ہوں۔ ایک



تو یہ ڈر تھا کہ وہ میری بات مان گئی اور دوسرے یہ کہ لڑکی شریف اور باوقار خاندان کی تھی۔ اُس نے میرے بیٹے کو سگی ماں بن کے دکھایا اور ایسا تو کئی بار ہُوا کہ اُسے پتہ چلا کہ بچّے کو کسی عورت نے کہہ دیا کہ تیری ماں کوئی اور ہے تو میری دوسری بیوی اُس کے گلے پڑ گئی اور نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچا دی۔ میں آپ کو کئی مثالیں دے سکتا ہوں لیکن فائدہ نہیں۔ آپ یہ شک دل سے اُتار دیں کہ پہلی بیوی نے لڑکے کو اغوا کرایا ہوگا یا لڑکا میری دوسری بیوی کے بُرے سلوک کی وجہ سے بھاگ گیا ہوگا۔ اگر پہلی بیوی کو اپنے بچے کے ساتھ پیار ہوتا تو وہ اُسے چھوڑ کے نہ جاتی۔ آپ تو قانون کے ماسٹر ہیں۔ دُودھ پینے والا بچّہ ماں سے لیا ہی نہیں جا سکتا۔ میرے بیٹے کو اپنی ماں کا احساس ہی نہیں۔"

"مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی بیوی ثابت نہ ہوئی"— میں نے کہا— "کرتی کیا تھی؟"

"امیر گھرانے کی بیٹی تھی"— اُس نے کہا— "امیری بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ خوشحالی کہہ لیں۔ اصل وجہ اس کی عمر تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں تو وہ میرے ساتھ بیاہ دی گئی تھی۔ میرے ماں باپ رشتہ مانگنے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی ابھی پندرہ سال کی ہے۔ ابھی منگنی کر آتے ہو جاتے تو ڈیڑھ دو سال بعد شادی ہو جائے گی لیکن اس کے ماں باپ نے کہا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے اور رشتہ مانگنے والے پیچھے پڑے رہتے ہیں اس لئے فوراً شادی ہو جاتے۔ اس طرح فوراً شادی ہو گئی....

"میں بھی جوان تھا۔ اتنی خوبصورت اور اتنی کمسن لڑکی مل جاتے تو آدمی ساری دُنیا کو بھول جاتا ہے لیکن لڑکی نے مجھے دوسرے طریقے سے دُنیا بھلا دی۔ وہ بہت شوخ اور کھلنڈری تھی۔ کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لیتی اور گھر کے تمام کام کاج اور ہانڈی روٹی تک نوکروں سے کراتی تھی۔ میری ماں سے کہتی تھی کہ وہ بھی کام کاج چھوڑ دے، نوکر کس کے لئے ہوتے ہیں۔ گھر میں مہمان آتے تھے تو اُن میں نہیں بیٹھتی تھی۔ کدکڑے

”اُن لوگوں نے جو مطالبہ کیا وہ میں نے پورا کیا۔ حق مہر ادا کیا۔ فالتو رقم بھیجی۔ ہماری طرف سے اُسے جو زیور دیا گیا تھا میں نے اُس کے پاس رہنے دیا لیکن اُنہوں نے واپس کر دیا۔ میں نے کچھ زمین بیوی کے نام کر دی۔ یہ ٹکڑے اُن کے اور میرے گاؤں کے درمیان تھے۔ یہ لڑکی اتنی پتھر دل ثابت ہوئی کہ مجھے تنگ کرنے کے لئے ایک سال کا بچّہ میرے پاس چھوڑ گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھی۔ اتنا سُنا تھا کہ وہ روتی رہتی ہے۔ اس کا مجھے بھی افسوس ہُوا مگر اس میں سنجیدگی اُس وقت آئی جب وقت گزر چکا تھا.... تو یہ ہے وہ بچّہ جو اَب اٹھارہ اُنیس سال کا ہو گیا ہے۔ اللہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔“

## عورت سے دلچسپی نہیں تھی

مَیں نے گمشدہ نوجوان کی ماں کو ذہن سے اُتار دیا۔ اس لڑکے کو میں کہانی سنانے کے لئے شفقت کہوں گا۔ اب میں نے اُس کے باپ سے اُس کے چال چلن، اُس کی دوستیوں اور اُس کی دشمنیوں کے متعلق پُوچھا۔

”لڑکا دراصل خراب ہو گیا تھا!“ ــــ اُس نے کہا ــــ ”یہ میرا پہلا بچّہ تھا اور بغیر ماں کے تھا اس لئے میں نے اسے بہت پیار دیا۔ اپنی دوسری بیوی کو میں نے سختی سے کہا تھا کہ اسے اپنی ماں کا احساس نہ ہونے دے اور خود اس کی ماں بن جائے۔ اُس نے میری خواہش پوری کی اور بچّے کو اتنا پیار دیا کہ وہ بگڑ گیا۔ میں بچّے کو کبھی ڈانٹ دیتا تو میری بیوی مجھے ٹوک دیتی اور بچّے کو گلے لگا لیتی۔ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ بچّہ جو مانگے اُسے دو اور جو ضد کرے وہ پوری کرو، یہی طریقہ ہے بچّے کی پرورش کا لیکن اس کا اثر بہت بُرا ہُوا۔ بچّہ ضدی ہو گیا اور سرکش۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ مَیں اُس کی ہر فرمائش پوری کرتا رہا....



لگاتی پھرتی تھی۔ سب کے سامنے میرے گلے میں بچّوں کی طرح بانہ ڈال لیتی۔ میں کھیتوں میں جاتا تو وہاں دوڑتی آ جاتی....

”میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھی۔ مجھے اس کے گاؤں سے پتہ چلا کہ اس کے ماں باپ نے اسی لئے اس کی شادی فوراً کر دی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خاندان کی عزّت خراب کرے گی۔ اُن کا یہ خطرہ غلط تھا۔ اخلاق کی بڑی پکّی تھی لیکن اُس نے بچپن نہ چھوڑا۔ مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شک ہوتا تھا کہ اس کا دماغ صحیح نہیں۔ اُس کے پیٹ میں جب پہلا بچّہ پرورش پانے لگا تو بھی اُس نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں۔ وہ ہنستی کھیلتی اچھی لگتی تھی لیکن ایک حد ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں، دیہات کے ماحول میں کتنی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ خاوند مرد ہی نہیں جس کے قابو میں بیوی نہیں آتی۔ میں تنگ آ گیا....

”پھر یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ بچّہ پیدا ہو گا تو یہ حقیقت اور اپنی ذمہ داری کو سمجھ لے گی مگر بچّہ پیدا ہُوا تو بھی اُس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ مجھے غصّہ اس کے ماں باپ پر آیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ اُنہوں نے اُلٹا مجھے ملزم بنا دیا۔ دونوں نے کہا کہ اسے تم نے خراب کیا ہے۔ ہم نے تو اسے کبھی اونچی سانس نہیں لینے دی تھی۔ میری اس ساس اور سُسر نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ یہ ذلیل حرکت بھی کی کہ میری بیوی اپنے گھر گئی۔ واپس آئی تو میرے ساتھ لڑنے لگی کہ میں نے اُس کی شکایت کی ہے۔ میں آپ کو سچّی بات بتاؤں۔ مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی اور اُس کے دل میں میری محبّت تھی مگر زندگی یہی نہیں ہوتی۔ اب یہ صورت پیدا ہو گئی کہ میرے ماں باپ اور اُس کے ماں باپ میں تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُس کی وجہ سے بزرگوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے ہیں اس لئے اُسے چاہیئے کہ سنجیدگی اختیار کرے لیکن وہ نہ مانی۔ پھر حالات اتنے خراب ہو گئے کہ میں نے دل پہ پتھر رکھ کر اُسے طلاق دے دی....

"پڑھنے میں تو اچھا رہا لیکن کھیل کُود اور یاری دوستی کا زیادہ شوقین تھا۔ نویں دسویں کے لئے شہر کے سکول میں داخل کرانا تھا۔ داخل کرا دیا اور بورڈنگ ہاؤس (ہوسٹل) میں رہنے کا انتظام کیا۔ یہاں آکر اُس کی عادتیں خراب ہو گئیں۔ پڑھنے میں دلچسپی نہ رہی۔ تاش کا عادی ہو گیا اور مجھے پتہ چلا کہ جُوا بھی کھیلتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ سُدھر جائے لیکن وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ میں اس کی ناراضگی سے ڈرتا تھا۔ ماشاء اللہ بڑا خوبصورت جوان نکلا لیکن آوارہ ہو گیا۔ ایک سال میٹرک میں فیل ہو گیا تو دوسری بار امتحان دینے سے انکاری ہو گیا....

"گاؤں میں وہ اِدھر اُدھر گھُومتا پھرتا رہتا یا کہیں تاش کھیلنے بیٹھ جاتا لیکن اُسے شہر جانے اور وہاں وقت گزارنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ دو تین دِنوں بعد شہر چلا جاتا اور شام کو آجاتا اور کبھی دو دو دن واپس نہیں آتا تھا۔ وہ بتا جاتا تھا کہ وہ دو دِن اپنے دوستوں کے پاس رہے گا۔"

"آپ اُس کے کسی دوست کا نام بتا سکتے ہیں جس کے پاس وہ شہر میں رہتا تھا؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا —"اُس نے کبھی کسی کا نام نہیں لیا تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ نے اُسے بہت بگاڑ دیا تھا"— میں نے کہا —"یہ معلوم کر لیا ہوتا کہ وہ شہر میں کس کے پاس آتا ہے۔"

اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں اُس کی مجبوری سمجھ گیا۔ بعض بڑے جابر باپ اس قسم کی اولاد کے ہاتھوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس باپ کا بھی وہی حال تھا۔ اس کے دوسری بیوی سے بچے ابھی اتنے جوان نہیں ہوئے تھے۔ اُس کا بڑھاپے کا سہارا یہی لڑکا شفقت تھا۔ اُسے وہ ناراض کرنے سے ڈرتا تھا مگر لڑکا غائب ہی ہو گیا۔

"میں نے تو اُس کی مِنت سماجت شروع کر دی تھی"— اُس نے



کہا —"ماں (دوسری بیوی) بھی اُسے سمجھاتی بجھاتی تھی۔ وہ تو اُس کے آگے رو بھی پڑتی تھی۔"

"آپ کی بیوی کو شاید اس کے شہر والے دوستوں کا کچھ پتہ ہو۔"

"وہ اب اس دُنیا میں نہیں"— اُس نے کہا —"دو سال ہوتے میری دوسری بیوی مر گئی ہے۔ اس کے بعد شفقت اور زیادہ آوارہ ہو گیا ہے۔ وہ اُسی کو ماں سمجھتا تھا اور اُسی کے پیار نے اُسے کچھ پابند رکھا ہُوا تھا۔"

"کبھی آپ کو شک ہُوا ہے کہ گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ اُس کے مراسم ہوں"— میں نے کہا —"یا آپ کو کبھی شکایت ملی ہو کہ اُس نے کسی لڑکی کا پیچھا کیا ہو۔"

"میں یہ بھی معلوم کر چکا ہوں"— اُس نے کہا —"آپ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نے اُس کے دوستوں سے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شفقت میں اور ہر عیب ہو سکتا ہے، اُس میں یہ عیب نہیں تھا....

"اس خیال سے کہ اس کے دوست اُس پر پردہ ڈالتے ہیں میں نے کئی آدمیوں سے پوچھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر گاؤں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا یہ شُغل ہوتا ہے کہ دوسروں کی حرکتیں دیکھتے اور قِصّے بناتے رہتے ہیں۔ میں نے کسی سے کہہ کر اس قسم کے تین آدمیوں سے پتہ کرایا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو بگاڑ دیا ہے لیکن عورت پر نظر نہیں ڈالتا....

"مجھے یہی شک تھا کہ میرے بیٹے نے کسی کی بہو بیٹی کے ساتھ تعلقات پیدا کئے یا کرنے کی کوشش کی ہے اور پکڑا گیا ہے۔ لڑکی والوں نے اسے پار کر دیا ہو گا۔ میں آپ کو راز کی ایک بات بتاؤں۔ ہمارے گاؤں میں ایک کمہارن ہے۔ جوانی میں خود ایسی ویسی رہی اور اب دوسروں کی یاریاں لگاتی ہے۔ میں نے اُسے الگ کر کے پیسے دیئے اور اس سے پوچھا کہ شفقت کس کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ شفقت بڑا

خوبصورت جوان ہے۔ فلاں گھرانے کی بیٹی نے اُسے پیغام بھیجا تھا لیکن شفقت نے کمہارن کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھر والوں کو بتا دے گا۔ کمہارن نے اُس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ بڑی خوبصورت ہے.....

"ہمارے گاؤں میں ہندو بھی ہیں۔ اُن کی عورتیں چال چلن کی بڑی کچی ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ہندوؤں کی دو جوان لڑکیاں جن میں ایک بیوہ اور دوسری شادی شدہ ہے شفقت کے پیچھے پڑی رہی ہیں مگر اس نے توجہ نہیں دی۔ اگر آپ کو یہ شک ہو کہ میں اپنے بیٹے کی بے بنیاد تعریفیں کر رہا ہوں تو یہ شک دل سے نکال دیں۔ میں تو خود اس کے چال چلن کی تفتیش کر چکا ہوں۔ آپ بھی کر لیں۔ مجھے شک ہے کہ وہ شہر میں جوا کھیلتا ہے اور ہو سکتا ہے شراب اور چرس بھی پیتا ہو۔ اگر وہ مارا گیا ہے تو مجھے اس کی لاش مل جاتے"۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی دھاڑ نکل گئی۔

وہ بڑے تحمل سے باتیں کر رہا تھا لیکن لاش کے لفظ نے اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے توقع یہی ہے کہ اس کا بیٹا قتل ہو چکا ہے اور قتل کی وجہ جوا ہو سکتا ہے یا کوئی ایسی لڑکی جس کے متعلق باپ نہیں جانتا۔ اُس نے بتایا کہ بیٹا پیسے بہت لے جایا کرتا تھا۔

میں نے اس سے کئی اور ضروری باتیں پوچھیں جن میں ایک ضروری بات یہ تھی کہ وہ کس وقت گھر سے نکلا اور کیا کہہ کر گیا تھا۔ باپ نے بتایا کہ دن بھر وہ گھر رہا۔ شام کو کچھ بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اُس نے جانے سے پہلے کپڑے بدلے تھے اور وہ کپڑے پہن کر گیا تھا جو وہ شہر جاتے پہنا کرتا تھا۔

میں نے کپڑوں کی تفصیل پوچھی اور رپورٹ درج کر لی۔ اس کے پاس بیٹے کا فوٹو تھا وہ میں نے لے لیا۔ اگر وہ تصویر جیسا تھا تو واقعی خوبصورت جوان تھا۔ باپ کو میں نے تسلی دلاسہ دے کر گھر بھیج دیا۔ اسے میں نے کہا تھا وہ اپنے طور پر سراغ لگاتا رہے اور کوئی خاص بات معلوم ہو تو مجھے



آکر بتائے۔ وہ اگر بیٹے کی کسی دشمنی کی نشاندہی کرتا یا یہ بتا سکتا کہ اس کی کسی عورت کے ساتھ دوستی بھی تو میں کوئی سراغ پا لیتا۔ اُس نے جو باتیں کی تھیں وہ میں نے آپ کو بہت مختصر سنائی ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ لڑکا جوان ہے اور کسی کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ وہ بچہ ہوتا تو تعاقب کیا جاتا۔ میں نے اُسی وقت اس گاؤں کے نمبر دار، ذیلدار، چوکیدار اور دو آدمیوں کو جو مخبری بھی کرتے تھے پیغام بھیجا کہ جلدی تھانے پہنچیں۔

## بیوی کو مارا بیٹا

وہ اکٹھے آگئے۔ میں نے سب کو اکٹھے بٹھا لیا اور اُن سے شفقت کے متعلق پوچھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ گاؤں میں اُس کے متعلق کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ عورت کے معاملے میں وہ بالکل صاف تھا۔ سگریٹ پیتا تھا۔ تاش کھیلتا تھا۔ جوا بھی کھیلتا ہو گا۔ گاؤں میں اُس کی کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں تھی کہ اسے غائب کر دیا جاتا۔ شہر کے متعلق ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی دوستی کس کے ساتھ تھی اور وہ کسی کے پاس آتا تھا۔

میں نے گاؤں کے ان لوگوں سے پوچھا کہ شفقت کی ماں کو طلاق ہو گئی تھی۔ کیا اس عورت نے بیٹے کو ورغلا لیا ہو گا؟

نہیں۔ ان سب نے متفقہ طور پر کہا کہ وہ لاپرواہ عورت تھی۔ اُس کی شادی ہو گئی تھی۔ یہیں شہر میں کہیں ہوتی ہے۔ اگر اُس نے کچھ کرنا ہوتا تو بہت پہلے بچے کو ورغلانے کا سلسلہ شروع کر دیتی۔

میں حیران تھا کہ یہ نوجوان آوارہ ہو گیا تھا، سگریٹ، چرس اور شراب تک پیتا تھا، گھر سے پیسے بھی زیادہ لے جاتا تھا مگر عورت کے معاملے میں وہ صاف تھا۔ مجھے یہ شک تھا کہ شہر میں آکر اُس نے جوا کھیلا۔ زیادہ رقم جیت گیا ہو گا۔ وہ شام کے بعد شہر میں آیا۔ رات کو واپس جا رہا

ہوگا۔ کسی نے رقم کی خاطر اسے قتل کر دیا اور لاش غائب کر دی۔

گاؤں کے ان آدمیوں کو میں نے فارغ کر دیا اور یہ کیس اے۔ ایس آئی کے حوالے کر دیا۔ مجھے یہ امید بھی تھی کہ شفقت خود ہی کہیں چلا گیا ہے اور سیر سپاٹا کر کے واپس آجائے گا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو پوری طرح سمجھا دیا کہ کیس کیا ہے اور وہ کیا کرے۔

سورج غروب ہو جانے کے بعد ایک اور کیس آگیا۔ چار آدمی آئے۔ سب معزز نظر آتے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ بات بوڑھے نے شروع کی۔ وہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا جو قصبے سے تقریباً بارہ میل دُور تھا۔ اس کی بیٹی قصبے میں ایک ٹھیکیدار کی بیوی تھی۔ بیٹی کی عمر اُس نے پینتیس سال کے لگ بھگ بتائی۔ اس کے ساتھ جو تین آدمی آئے تھے وہ قصبے کے اُس محلے کے رہنے والے تھے جہاں اس کی بیٹی اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔

"میری رپورٹ یہ ہے جناب!" — بوڑھے نے کہا — "میں تین روز گزرے، گاؤں سے اپنی بیٹی اور داماد سے ملنے آیا تو داماد نے مجھے دروازے میں روک دیا۔ کہنے لگا کہ امینہ (اُس کی بیٹی) کہیں باہر چلی گئی ہے۔ رات کو شاید نہ آئے۔ میں نے کہا تو کیا ہُوا۔ میں صرف بیٹی کو دیکھنے تو نہیں آیا۔ اُس نے کہا کہ میں بھی باہر جا رہا ہوں۔ آپ پھر کبھی آئیں .... جناب! میں تو یہ سمجھا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ اپنے داماد کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ اُس نے ایسا سلوک کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کا یہ کہنے سے کیا مطلب ہے کہ پھر کبھی آئیں؟ ....

"اُس نے کہا — 'میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ آپ کو نہ میں ملوں گا نہ آپ کی بیٹی۔ آپ اکیلے بیٹھے کیا کریں گے؟' — ایک دو اور باتوں کے بعد اُس نے مجھے کسی اور لہجے میں چلے جانے کو کہا۔ میں حیران و پریشان اپنے گاؤں چلا گیا۔ میری بیوی مر چکی ہے۔ بیٹا کوئی نہیں۔ میں سوچتا رہا اور اگلے دن پھر یہاں آیا۔ مجھے اُمید تھی کہ میرا داماد اپنے کام پر گیا ہُوا ہو



گا اور میں اپنی بیٹی سے مل سکوں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ اس کے خاوند کو کیا ہو گیا ہے مگر دروازہ کھٹکھٹایا تو داماد نے دروازہ کھولا۔ اُس نے میرے ساتھ پھر وہی سلوک کیا۔ کہنے لگا کہ آپ کی بیٹی دو دِنوں کے لئے ایک شادی پر چلی گئی ہے ....

"میری بیٹی کی ایک بیٹی ہے۔ سولہ سترہ سال کی ہے۔ اُس کی پوچھی تو داماد نے کہا کہ وہ بھی گھر نہیں ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ مجھے اندر کیوں نہیں جانے دیتا؟ اُس نے کہا — 'آپ دو روز بعد آئیں۔ ہم سب آپ کو مل جائیں گے' — میں بچہ تو نہیں جناب! یہ عمر ہو گئی ہے۔ میں داماد کے گھر سے تو نکل آیا لیکن شہر میں ہی رہا" — اُس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا — "یہ میرے داماد کے پڑوسی ہیں اور ان کے ساتھ میری میل ملاقات ہے۔ رات کو میں ان کے گھر چلا گیا۔ رات کو اس لئے گیا تھا کہ میرا داماد نہ دیکھ لے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا داماد مجھے گھر میں داخل نہیں ہونے دے رہا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟ ....

"انہوں نے بتایا کہ چار روز گزرے، صبح ہی صبح میرا داماد میری بیٹی کو مار پیٹ رہا تھا۔ میری بیٹی کا شور سُن کر اُن کے گھر کی عورتیں چھت پر آ گئیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ میرا داماد بہت بُری طرح میری بیٹی کو مار رہا تھا۔ وہ برآمدے میں تھے۔ میری بیٹی باہر کو بھاگنے لگی تو میرے داماد نے اُس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑائی۔ وہ مُنہ کے بل گری۔ میرا داماد اسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ اس کے بعد میری بیٹی اور بیٹی کی بیٹی نظر نہیں آئیں۔ یہ دو حضرات بھی میرے داماد کے پڑوسی ہیں۔ یہ تینوں اکٹھے ہو گئے۔ آج کا دن ہم وکیلوں سے مشورے کرتے رہے ہیں۔ دو وکیلوں سے ملے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ پولیس کو رپورٹ دی جائے۔ ہم آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ جناب! مجھے شک ہے کہ میری بیٹی مر چکی ہے اور اُس کی بیٹی کا کچھ پتہ نہیں۔ میرا شک یہ بھی ہے کہ میری بیٹی کی لاش اندر پڑی ہے۔"

میں نے اُس کے ساتھ آتے ہوئے آدمیوں سے پوچھا کہ انہوں نے کیا دیکھا اور سمجھا ہے۔ تینوں نے ایک ہی بات بتائی۔ اس بوڑھے کی بیٹی کبھی چھت پر نظر آجاتی تھی کبھی باہر۔ اب نہ ماں نظر آتی تھی نہ بیٹی۔ عورتیں ایک دوسرے کے گھروں میں جایا کرتی ہیں۔ امینہ کے گھر دو عورتیں گئیں تو امینہ کے خاوند نے انہیں کہا کہ امینہ اپنی بیٹی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی ہے۔ بہرحال ان چاروں نے مجھے یقین دلا دیا کہ کوئی بڑی سنگین گڑبڑ ہے۔

## بیٹی کو کہیں بھگا دیا

میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ان لوگوں کی راہنمائی میں ٹھیکیدار کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ٹھیکیدار باہر آیا۔ اُس کے سُسر نے کہا کہ یہی میرا داماد ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اپنی بیوی تک لے چلے۔ اُس نے کہا کہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ جہاں کہیں ہے مجھے وہاں لے چلے۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کہنے لگا کہ ذرا میری ایک بات سُن لیں۔ میں اُس کے ساتھ ذرا پرے ہو گیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں کچھ لے کر ٹل جاؤں۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا کہ وہ مجھے کتنا کچھ دے گا۔

"اپنے مُنہ سے مانگیں" — اُس نے کہا — "ابھی حاضر کروں گا"

"لیکن اپنا جُرم تو بتاؤ" — میں نے کہا — "مجھے آپ کے جُرم پر پردہ ڈالنا ہے۔ یہ لوگ جو مجھے ساتھ لاتے ہیں انہیں بھی کسی طرح راضی کرنا ہے"

وہ ٹھیکیدار تھا۔ افسروں کے ساتھ اُس کا میل جول تھا اس لئے بڑی دلیری اور خود اعتمادی سے باتیں کرتا تھا۔ کہنے لگا — "یہ آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ میں آپ کو رقم ادا کر دوں گا۔ ابھی۔ فوراً۔ اور آپ



یہاں سے چلے جائیں"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی اور کہا — "اسے گرفتار کر لو"

اب اُس کا تڑپنا دیکھنے کے قابل تھا۔ اُس نے ڈیوڑھی میں اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نے کانسٹیبلوں کو روک دیا اور اُسے کہا کہ مجھے اپنی بیوی کے پاس لے چلے۔ وہ سر جُھکا کر اندر کو چل پڑا۔ ہم سب اُس کے پیچھے گئے۔

اُس کی بیوی (امینہ) چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اُس کا ایک بازو پٹیوں میں تھا۔ میں نے نمبردار اور محلّے کے دو معزز افراد کو پہلے ہی ساتھ لے لیا تھا۔ میرے کہنے پر سب کے سامنے امینہ نے بیان دیا کہ خاوند نے اُسے بہت مارا پیٹا ہے اور اُس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا خاوند ایک جراح کو ساتھ لایا تھا۔ اُس نے ہڈی جوڑ کر یہ پلستر کر دیا ہے۔ خاوند ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ زبان بند رکھنا ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ میں ہل جل نہیں سکتی اور یہ مجھے کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں دیتا۔

اس کے بیان کے دوران اس کا خاوند بول پڑتا تھا۔ میں اُسے چُپ کرا دیتا تھا۔ میں نے اس کی چارپائی اٹھوائی اور ہسپتال لے گیا۔ اُس کے خاوند کو تھانے پہنچا دیا۔ اُس سے بیان لیا تو اُس نے کہا کہ یہ بڑی چالباز عورت ہے۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ خاوند کا الزام تھا کہ امینہ نے اپنی بیٹی کو کسی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ بھگا دیا ہے۔ بیٹی بہت سا زیور اور نقد رقم اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ خاوند نے یہ بھی بتایا کہ امینہ نے ایک آدمی کا نام اور اُس کے گاؤں کا نام بتا کر کہا تھا کہ بیٹی اس کے ساتھ گئی ہے۔

"میں اُس گاؤں گیا" — خاوند نے کہا — "وہاں اس نام کا کوئی آدمی نہ ملا نہ کوئی اس نام کا آدمی وہاں تھا۔ میں نے لڑکی کا رشتہ ایک جگہ دے دیا تھا۔ میری بیوی کو وہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ اُسے جو لڑکا پسند تھا اس کے

ساتھ اس نے بیٹی کو بھگا دیا ہے ..... آپ مجھے گرفتار کر لیں لیکن میری رپورٹ بھی درج کریں۔ اس عورت نے میری بیٹی کو گھر سے بھگا دیا ہے اور زیورات اور رقم چوری کر کے بیٹی کو دی ہے۔ کیا یہ جرم نہیں؟ میں اس کا یہ جرم ثابت کروں گا۔ میرے پاس گواہ موجود ہیں۔"

میں نے اس سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ جرح کی اور میں قائل ہو گیا کہ اپنی بیوی کے خلاف اس کا بھی کیس بنتا ہے۔ یہ شخص بڑا ہوشیار معلوم ہوتا تھا اور قانون سے بھی کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان دونوں نے بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزاری ہے اور اب ان میں بڑا سنگین اختلاف بلکہ جھگڑا پیدا ہو گیا ہے تو مجھے خیال آیا کہ ان کا راضی نامہ کرا دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں اس کی بیوی سے اور بیوی کے باپ سے بات کرتا۔

میں نے امینہ کے باپ اور اس کے پڑوسیوں کو الگ بٹھا کر بتایا کہ ٹھیکیدار امینہ کے خلاف کیس رجسٹر کرانا چاہتا ہے اور اس کے پاس ثبوت موجود ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں ٹھیکیدار کے خلاف کیس بنا رہا ہوں اور اس کا کیس امینہ کے خلاف رجسٹر کر لوں گا۔ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ صلح سمجھوتہ کر لو ورنہ عدالتوں میں مارے مارے پھرتے رہو گے۔

امینہ کے باپ نے کہا کہ امینہ کے ساتھ بات کر لی جائے۔ یہ مجھے کرنی تھی۔ ابھی مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اس کے زخم اور چوٹیں کیسی ہیں۔ اُس کے مرنے کا خطرہ تو نہیں۔

میں اُسی وقت ہسپتال چلا گیا۔ امینہ کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے پہ اسے دودھ پلایا گیا تھا اور ڈاکٹر رپورٹ لکھ رہا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شدید ضرب بازو کی تھی۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ باقی ضربیں اندر کی تھیں جو خاصی زیادہ تھیں۔ امینہ اب ہوش میں تھی اور باتیں کر سکتی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے





خاوند کو تو میں گرفتار کر رہا ہوں لیکن وہ اُس کے خلاف بڑا سنگین کیس بنا رہا ہے۔ میں نے اُسے تفصیل بتائی اور کہا کہ ٹھیکیدار اثر ورسوخ والا آدمی ہے۔ وہ کیس ثابت کر دے گا۔

امینہ نے کہا کہ اُسے کچھ علم نہیں کہ اس کی بیٹی کس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ امینہ کہتی تھی کہ اُسے دوسرے دن کی شام پتہ چلا تھا کہ اُس کی بیٹی زیورات اور کچھ رقم بھی ساتھ لے گئی ہے۔ میں نے امینہ سے کہا کہ وہ سوچ لے اور اپنے خاوند کے ساتھ راضی نامہ کر لے۔ امینہ ڈر گئی اور رضامند ہو گئی۔ میں نے اُس کے خاوند سے کہا کہ امینہ کہتی ہے کہ اسے بالکل علم نہیں کہ اُس کی بیٹی کس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ صلح کر لے ورنہ اُس کے خلاف مضبوط کیس بن رہا ہے اور عینی شاہد موجود ہیں۔ اُس نے پہلے تو انکار کر دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کا کیس کمزور ہو گا کیونکہ اُس نے گرفتار ہو کر بیوی کے خلاف کیس درج کرایا ہے۔ عدالت میں یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ ٹھیکیدار نے انتقاماً کیس بنایا ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں فریق مان گئے۔ امینہ کے باپ نے داماد کو گلے لگایا اور میں نے ٹھیکیدار کو جانے کی اجازت دے دی۔ امینہ کو ابھی ہسپتال میں رہنا تھا۔ اُس کا باپ ہسپتال میں امینہ کے ساتھ رہنے کے لئے چلا گیا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ٹھیکیدار گھر جانے سے پہلے امینہ کے پاس گیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے معافی مانگی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے اُن کی ازدواجی زندگی بچا لی تھی۔ اُن کی بیٹی کی گمشدگی کا مسئلہ تھا لیکن وہ اس مسئلے کو ہضم کر گئے۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھواتے۔

اگلی رات کا ذکر ہے۔ بارہ سوا بارہ بجے ہوں گے۔ ان تین آدمیوں میں سے ایک جو امینہ کے باپ کے ساتھ آتے تھے، تھانے میں آیا۔ مجھے جگایا گیا۔ اس آدمی نے بتایا کہ امینہ کا خاوند اپنے صحن میں بُری طرح

زخمی پڑا ہے۔ اُس شخص نے بتایا کہ اتفاق سے اُس کی بیوی بیت الخلاء میں جانے کے لئے اُٹھی۔ اُسے ٹھیکیدار کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ یہ شخص اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ ٹارچ لے کر چھت کی طرف سے ٹھیکیدار کے گھر میں اُترا۔ اُس وقت ٹھیکیدار خاموش ہو چکا تھا۔ دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ صرف یہ الفاظ صاف تھے ——”بدکار نے مروا دیا۔ راضی نامے کا دھوکہ دے گئی“—— پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

اُس نے بتایا کہ محلّے کا چوکیدار ٹھیکیدار کے دروازے پر کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اُس نے ایک آدمی کو باہر نکلتے اور بھاگتے دیکھا ہے۔

معاملہ سنگین تھا۔ پہلا مشتبہ جو میرے ذہن میں آیا وہ امینہ تھی۔ امینہ کے ساتھ اُس کا باپ یاد آیا۔ اس کا باپ اپنے گاؤں کا سرکردہ زمیندار تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو یہ کہہ کر ہسپتال کو دوڑا دیا کہ امینہ کا باپ اگر وہیں ہے تو اُسے تھانے لے آئے۔ میں خود ضروری سٹاف کو ساتھ لے کر ٹھیکیدار کے گھر کو دوڑ پڑا۔

وہ نیم غشی میں پڑا تھا۔ اُس کے ایک بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔ پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ گلی کے سرے پر تھا۔ گلی کی بتی کی روشنی میں اُس نے ایک آدمی اس کے گھر سے نکلتے دیکھا جو تیز دوڑتا دوسری طرف چلا گیا۔ چوکیدار اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکا، نہ اُس کے کپڑے اُسے نظر آئے کہ کس رنگ کے ہیں کیونکہ بتی کی روشنی مدھم تھی۔

زخمی کو چارپائی پہ ڈالا اور ہسپتال بھجوا دیا۔ میں نے رپورٹ دینے والے آدمی کو اور دو اُن آدمیوں کو جو جاگ کر آگئے تھے ساتھ لیا اور مکان کے کمرے اور سامان وغیرہ دیکھا۔ میں اسے چوری یا ڈکیتی کی واردات سمجھتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ شک بھی تھا کہ امینہ یا اُس کے باپ



یا دونوں نے ٹھیکیدار پر انتقامی وار کیا ہے۔ امینہ کا باپ یہ وار کروا سکتا تھا، لیکن یہ واردات ڈکیتی کی بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ٹرنک سوٹ کیس وغیرہ اس طرح رکھے تھے جیسے انہیں کسی نے نہ چھیڑا ہو۔ سب مقفل تھے۔ اصل واقعہ تو مضروب ٹھیکیدار ہی بتا سکتا تھا۔ میں نے مکان بند کر کے ایک کانسٹیبل کو پہرے پر کھڑا کر دیا۔

ہسپتال جا کے دیکھا۔ ہندو ڈاکٹر مضروب کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ مجھے مضروب کا بیان لینا تھا۔ میں نے امینہ کے وارڈ میں جا کے دیکھا۔ وہ سوتی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اُس کی عمر پینتیس چھتیس سال ہے۔ اس بیماری کی حالت میں بھی وہ حسین تھی اور اپنی عمر سے زیادہ لگنے کی بجائے تیئس چوبیس سال کی لگتی تھی۔ وہ اتنی گہری سوئی ہوئی تھی کہ میں اُس کے پاس کھڑا رہا اُس کی آنکھ نہ کھلی۔

وارڈ کی ایک ملازمہ آگئی۔ اس سے امینہ کے باپ کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ کل رات اُس نے برآمدے میں گزاری تھی صبح سویرے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد نہیں آیا۔ رات کو وہ بہت دیر امینہ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ڈاکٹر نے مجھے اپنی رپورٹ دکھائی۔ ٹھیکیدار کا گہرا اور شدید زخم بازو کا تھا جہاں سے ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک ضرب سر پر بھی جو لاٹھی یا موٹے ڈنڈے کی معلوم ہوتی تھی۔ اس سے خون نکلا تھا۔ جسم پہ ڈنڈے یا لاٹھی کی بہت سی ضربیں تھیں۔ وہاں سے جگہیں اُبھری ہوئی اور نیلی ہو گئی تھیں۔ میں نے مضروب کو جا کر دیکھا۔ وہ کراہ رہا تھا لیکن ہوش میں تھا۔ ڈاکٹر ساتھ تھا۔ اُس نے کہا کہ بیان لینے میں کوئی حرج نہیں۔

میں نے بیان لیا۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی ——”مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ میری بیوی اور اس کے باپ نے مجھے مروایا ہے۔ اس

کا ثبوت یہ ہے کہ جس نے مجھ پر حملہ کیا ہے وہ بار بار کہتا تھا — ’تمہارا اُس سے بُرا حال کروں گا جو تم نے اُس کا کیا ہے‘ — میں ابھی ہوش میں تھا جب اُس نے میرا بازو پکڑا۔ میں فرش پر گر پڑا تھا۔ اُس نے میری کہنی پر پاؤں رکھا اور کلائی سے بازو پکڑ کر اتنی زور زور سے اُوپر جھٹکے دیئے کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ زور لگاتا اور کہتا جا رہا تھا — ’تم نے اُس کا بازو توڑا ہے ․ ․ ․ ․ تم نے اُس کی ہڈی توڑی ہے‘ — اُس وقت میری چیخیں نکلیں جو سارے شہر نے سُنی ہوں گی“

اس سے میں نے سوچا کہ حملہ آور بہت ہی طاقتور ہوگا۔ اس طرح ہڈی توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ حملہ آور بالکل جوان ہوگا۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ وہ سویا ہُوا تھا کہ اُسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ بتی جگانے والے نے جلاتی تھی۔ وہ جونہی گھبرا کر اُٹھا اُسے پہلا ڈنڈہ کندھے پر پڑا۔ اُسے لاٹھی سے نہیں ڈنڈے سے پیٹا گیا تھا۔ اُس نے پہلے تو مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ اُس نے ٹھیکیدار کے پیٹ میں لات ماری ٹھیکیدار درد سے آگے کو جُھکا۔ حملہ آور نے اُسے پیٹھ پر ڈنڈے مارے۔ وہ سیدھا ہُوا تو ایک ضرب سر پر پڑی۔ اس کے بعد وہ سنبھل ہی نہ سکا۔ پھر حملہ آور نے اُس کا بازو توڑ دیا اور وہ بھاگ گیا۔ ٹھیکیدار گرتا پڑتا صحن تک آیا اور گر پڑا۔

ٹھیکیدار نے حملہ آور کے کپڑوں کا رنگ بتایا اور یہ کہ اُس نے مُنہ پر رومال اس طرح باندھ رکھا تھا کہ آدھی ناک اور مُنہ ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ قد آور جوان تھا۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ اس حُلیے میں وہ سامنے آئے تو وہ اُسے پہچان سکتا ہے۔

## وہ انکار کرتی رہی

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو ہسپتال بلایا اور اسے کہا کہ وہ ابھی



گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے اور امینہ کے باپ کے گاؤں جا کر اسے ساتھ لے آئے۔ راستے میں اُسے کچھ نہ بتائے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو روانہ کر کے میں امینہ کے وارڈ میں چلا گیا۔ صبح طلوع ہونے والی تھی۔ میں امینہ کے وارڈ میں گیا۔ وہ جاگ اُٹھی تھی۔ آج کل کی پَود کے لئے یہ عجیب ہوگا کہ ہسپتال کے اتنے بڑے وارڈ میں ایک امینہ تھی اور ایک اور مریضہ تھی۔ اُس زمانے میں بیماریوں کا یہ حال نہیں تھا کہ ہسپتال کے برآمدوں میں جگہ نہیں ملتی۔

”امینہ!“ — میں نے اُسے کہا — ”میں نے تم پر بہت بڑا احسان کیا تھا کہ راضی نامہ کرا دیا تھا مگر تم نے اتنا بڑا جُرم کرایا ہے کہ سمجھ نہیں آتی تمہیں کس طرح بچاؤں گا۔“

اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ مُنہ کُھل گیا۔ آنکھیں کُھل گئیں۔ سرگوشی کی طرح بولی — ”کیا جُرم کروایا ہے میں نے؟“

میں نے اسے بتایا۔ وہ قسمیں کھانے لگی کہ اُسے کچھ پتہ نہیں۔ وہ بھلا خاوند کو کس سے پٹوا سکتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ حملہ آور بار بار کہتا تھا کہ وہ تمہارا بدلہ لے رہا ہے۔ تمہارے خاوند نے تمہارے بازو کی ہڈی توڑی ہے۔ تمہارے خاوند پر قاتلانہ حملہ کرنے والے نے تمہارے خاوند کا بازو توڑ دیا اور کہا ہے کہ تم نے اُس کی ہڈی توڑی تھی۔

امینہ نے رونا شروع کر دیا۔ وہ لپک لپک کر میرے ہاتھ پکڑتی قسمیں کھاتی اور روتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں مان لیتا ہوں کہ حملہ تم نے نہیں کرایا لیکن تم جانتی ہو وہ کون ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ تم نہیں تو تمہارا باپ جانتا ہوگا۔ وہ ابھی ہتھکڑیوں میں بندھا ہُوا تھانے میں آجائے گا۔ اُس کی گرفتاری کے لئے پولیس چلی گئی ہے۔

امینہ کی حالت ایسی ہوگئی جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں تو اسے ہسٹیریا کا دورہ سمجھنے لگا۔ وہ رو رو کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتی تھی کہ میرے

باپ کو ہتھکڑی نہ لگانا۔ وہ ایسی حرکت نہ خود کر سکتا ہے نہ کسی سے کرا سکتا ہے۔ وہ تو رات کو مجھے پند و نصیحت کرتا رہا ہے کہ اپنے خاوند کے ساتھ بنا کے رکھو۔

"امینہ! میری بات غور سے سنو" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نہ مانو۔ میرے پاس ثبوت ہے کہ اپنے خاوند پر تم نے یا تمہارے باپ نے حملہ کرایا ہے۔ اگر تمہارے خاوند کے گھر چوری ہوتی ہوتی تو میں سمجھتا کہ چوروں نے اسے مارا پیٹا ہے۔ گھر کی کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حملہ آور تمہارے خاوند کو مارنے پیٹنے یا قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ میں نے پہلے بھی تمہارا فائدہ سوچا تھا۔ اب بھی تمہاری کچھ بچت کر سکتا ہوں بشرطیکہ اپنے راز میں مجھے شریک کر لو۔ نہیں کرو گی تو میں تمہیں گرفتار کر لوں گا۔ میں مجرم کو پکڑنا جانتا ہوں۔"

جس شدت سے اور جس طریقے سے وہ جرم سے انکار کر رہی تھی اس سے مجھے کچھ ایسا شک ہونے لگا تھا کہ اس جرم میں اس کا ہاتھ نہیں، اور ہو سکتا ہے ٹھیکیدار جٹ بدل رہا ہو۔ وہ امینہ کو پھنسانا چاہتا ہو گا۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ حملہ آور کون ہے۔ امینہ کو مصیبت میں ڈالنے کے لئے اسے بڑا مضبوط اور قابلِ یقین بہانہ مل گیا تھا لیکن میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس نے امینہ کو مارا پیٹا اور کسی نے اسے اسی طرح مار پیٹ دیا۔ بہرحال میں نے امینہ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر اس سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے۔ وہ لاعلمی کا اظہار کرنے لگی۔ میں نے اسے کہا کہ اسے اپنی بیٹی کے لئے اپنے خاوند کا پسند کیا ہوا رشتہ کیوں پسند نہیں تھا۔ اس نے کئی نقص بتا دیئے۔ میں نے ادھر زیادہ توجہ نہ دی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اسے جو لڑکا پسند تھا اس نے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کو بھگا دیا ہو۔

میں نے امینہ سے کہا کہ وہ مجھے سچی بات بتا دے گی تو میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا۔ اگر اسی طرح مجھے چکر دیتی رہی تو اس



کا انجام بہت برا ہو گا۔ اسے میں بہت بری حالت میں چھوڑ کر آگیا۔

## وہ رات کو آیا

امینہ کے باپ کو گاؤں سے لے آئے۔ اس کے ساتھ میں نے ذرا احتیاط اور استادی سے باتیں کیں کیونکہ وہ معمّر اور جہاندیدہ آدمی تھا لیکن اس نے امینہ سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنی بیگناہی اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے بھی میں نے امینہ کی طرح ڈرایا، گھیرا اور بہت جھک جھک کی مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ امینہ عورت تھی، اس لئے روتی تھی۔ اس کا باپ مرد تھا اور باعزت آدمی تھا۔ میرے ہر سوال کا ایسا جواب دیتا کہ میرا منہ پھیر دیتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ لے۔ اسے ایک کانسٹیبل کی نگرانی میں الگ بٹھا دیا۔

میں رات کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا آرام کی سوچ رہا تھا کہ شفقت کا باپ آگیا۔ اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا۔ اس کا کیس اے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کر دیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ شفقت کے باپ سے میں نے پوچھا کہ بیٹے کا کچھ سراغ نکلا یا نہیں۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک مخبر نے شفقت کے ایک دوست کا سراغ لگایا ہے۔ وہ اس کے پاس آ کر ایک دو دن ٹھہرا بھی کرتا تھا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے بڑے تھکے ہوئے اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا کہ بلاؤ اس دوست کو اور تفتیش کچھ آگے بڑھاؤ۔

اے۔ ایس۔ آئی اٹھ کھڑا ہوا۔ شفقت کا باپ میرے قریب آگیا۔ برآمدے میں امینہ کا باپ بیٹھا تھا۔ شفقت کے باپ نے امینہ کے باپ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ــــ "یہ آدمی تھانے میں کیوں آیا ہے؟"

"آپ جانتے ہیں اسے؟"

"جی ہاں!" ــــ اس نے کہا ــــ "یہ میرا پہلا سسر ہے۔ آج سترہ اٹھارہ سال بعد اسے دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے اسے بتایا کہ کیا ہُوا ہے اور اسے کیوں تھانے بٹھایا ہے۔ اس کی پہلی بیوی امینہ کے متعلق بھی بتایا پھر اُس سے پوچھا کہ یہ آدمی کیسا ہے۔ میں شفقت کے باپ کی راستے اور اخلاق پر حیران ہُوا۔ اس نے کہا —"اس کے ساتھ میری سلام دعا بھی بند ہے لیکن یہ اس قسم کا جُرم نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے امینہ اب بدل گئی ہو۔ اگر پہلے کی طرح ہے تو اپنے خاوند کو یوں پٹوانے کا جُرم نہیں کر سکتی۔ بہرحال آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں"— وہ مجھ سے ہٹ گیا اور اپنے سابق سُسر سے جا ہاتھ ملایا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے سابق سُسر سے کہہ رہا تھا — "میں ہر طرح حاضر ہوں۔ دل سے اور جان سے ساتھ دوں گا"

میں اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں اُٹھا تو اے۔ ایس۔ آئی کہنے لگا کہ اُس گمشدہ لڑکے کے دوست کو بلایا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ شفقت اُس کے پاس آیا کرتا تھا اور پندرہ سولہ دنوں سے اُسے نہیں دیکھا لیکن میرے مُخبر نے میرے کان میں ڈالی ہے کہ اُسے شفقت کا جو فوٹو دکھایا گیا تھا اس سے ملتا جُلتا ایک قد آور جوان اس کے گھر شام کے وقت آیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ مُخبر نے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا۔ میں نے تین مُخبروں کو شفقت کی فوٹو دکھائی تھی۔ شفقت دلکش رنگ کا قد آور جوان تھا۔ شہر کے ہجوم میں کسی ایک آدمی کو پہچان لینا آسان نہیں ہوتا لیکن شفقت چہرے کی دلکشی اور قدبُت سے الگ تھلگ نظر آتا تھا۔ شام کے بعد جب بازار بند ہو گئے تھے، اس مُخبر نے لاریوں کے اڈے پر شفقت کو دیکھا تھا اور یہ خوبصورت جوان اس کے دل کو اچھا لگا تھا۔ قصبے میں اُس کے لئے وہ اجنبی بھی تھا۔ مُخبر کو تھانے میں دیکھا ہُوا فوٹو یاد آ گیا۔ اُس نے شفقت کا پیچھا کیا۔ مُخبر نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ شفقت بازار میں سے گذرنے کی بجائے اندھیری گلیوں میں چلا گیا۔ مُخبر نے صبح اے۔ ایس۔ آئی کو بتایا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے



امینہ کے باپ کو ساتھ لانے کے لئے گاؤں بھیج دیا تھا۔

میں نے شفقت کے دوست اسلم سے پوچھا کہ وہ کون تھا جو شام کے بعد اُس کے گھر آیا تھا۔ اس کا نام اور پتہ بھی بتاؤ۔

اسلم کوئی پختہ کار جرائم پیشہ نہیں تھا کہ تھانے میں دو تھانیداروں کے سامنے ثابت قدم رہتا۔ میں اُس کی خاموشی اور گھبراہٹ سے سمجھ گیا کہ اس کے پاس جو آیا تھا وہ شفقت ہی تھا۔ مجھے اطمینان ہُوا کہ گمشدگی کا کیس یہیں پر ختم ہو گیا ہے مگر یہ شہری نوجوان ابھی خاموش تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا اور پوچھا کہ وہ بولتا کیوں نہیں۔

"اوتے!"— میں نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا مُنہ اُوپر اُٹھایا اور کہا —"میں نے کیا پوچھا ہے؟"— میں نے اُسے بدستور چُپ دیکھ کر اے۔ ایس۔ آئی سے کہا —"اسے حوالات میں بند کر دو۔ رات کو اس سے بات کریں گے۔"

پہلے اُس کے ہونٹ کانپے پھر اُس کا جسم کانپا پھر اُس کے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ تو نہ کہہ سکا، اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ میں نے اُس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں پر بڑی زور سے تھپڑ مارا اور گرج کر کہا —"جو بکنا ہے مُنہ سے بک!"

اُس نے رونا شروع کر دیا۔ میرے مزید ڈانٹنے دبکارنے پر اُس نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔

"میں اُس کے ساتھ نہیں تھا"— اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا —"میں بتا دوں گا وہ کہاں ہے۔ آپ اس سے پوچھ لیں۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ اُن کے گھر میں کیوں اُتر رہا ہے۔ صبح پتہ چلا کہ اُس نے ٹھیکیدار کو مار دیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔"

پہلے وہ چکرا رہا تھا۔ اب میرا سر چکرانے لگا کہ یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ کیا شفقت نے ٹھیکیدار پر حملہ کیا تھا؟ میں اسلم کے مُنہ پر تھپڑ مارنے لگا

لیکن میں نے اپنا تجربہ استعمال کیا۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ سراغ لگاتے لگاتے ایسا مجرم پکڑا جاتا ہے جس کے متعلق کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ جرم اس نے کیا ہوگا۔

”ہاں، بولتے جاؤ“ — میں نے اسلم سے کہا — ”تم اس کے ساتھ نہیں تھے تو تمہیں گرفتار نہیں کروں گا۔ اگر تم نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو تین سال کی سزا سے قید دلاؤں گا۔“

## کھڑکی کے راستے اندر آگئی

اُس نے بیان دینا شروع کیا۔ میں اُس سے سوال کرتا گیا۔ اُس کے جوابوں میں سے سوال نکالے اور جو عجیب و غریب انکشاف ہُوا وہ مختصراً یہ تھا کہ شفقت اسلم کا دوست تھا۔ شفقت میٹرک میں فیل ہو گیا تو بھی وہ گاؤں سے شہر آتا رہا۔ وہ اسلم کے گھر آتا تھا اور قیام کرنا ہوتو اسلم کے گھر ہی کرتا تھا۔ اسلم امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اس کا مکان دو منزلہ تھا۔ اسلم کا کمرہ اُوپر تھا۔ شفقت اسلم کے ساتھ اسی کمرے میں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس سے تیسرا مکان امینہ اور ٹھیکیدار کا تھا۔ چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ شفقت اور اسلم دسویں جماعت میں پڑھتے تھے جب شفقت کی نظر ٹھیکیدار کی بیٹی شاہدہ پر پڑی تھی۔ اُس وقت شاہدہ کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔

نظر اس طرح پڑی کہ شاہدہ اپنی چھت پر آیا کرتی اور اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی تھی۔ اسلم کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ اس کی دو کھڑکیاں شاہدہ کی چھت کی طرف کھلتی تھیں۔ شفقت جوا بھی کھیلتا تھا، سگریٹ بھی پیتا تھا اور کبھی کبھار شراب بھی پی لیتا تھا لیکن اُس نے کبھی کسی عورت کو بُری نظر سے نہیں دیکھا تھا نہ اُس نے کبھی عورتوں کی باتیں کر کے دل خوش کیا تھا لیکن شاہدہ کی خوبصورتی نے اُس پر ایسا جادو کیا کہ وہ شاہدہ کو دیکھنے کے لئے کھڑکی کھلی رکھا کرتا تھا۔



شاہدہ نے اپنی چھت سے اُسے کھڑکی میں دیکھا۔ پھر صاف پتہ چلنے لگا کہ شاہدہ شفقت کو دلچسپی سے دیکھتی ہے۔ ایک روز شفقت گاؤں سے آیا اور اسلم کے کمرے کی کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ بہت انتظار کے بعد شاہدہ اُوپر آئی۔ شفقت نے ایسی حرکت کبھی نہیں کی تھی۔ اُس نے شاہدہ کو اشارہ کیا تو شاہدہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی درمیان والے مکان کی چھت سے گزرتی کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اسلم ایک طرف ہو گیا تھا۔ لڑکی شفقت کو تنہا سمجھتی رہی۔ شفقت نے اُسے کہا کہ مجھے لوفر اور بدمعاش نہ سمجھ لینا۔ تمہاری عزّت کو اپنی عزّت سمجھوں گا۔ دل نے مجبور کر دیا تھا اس لئے تمہیں اشارہ کر بیٹھا تھا۔

پھر شفقت تیسرے چوتھے روز گاؤں سے اسلم کے پاس آنے لگا۔ شاہدہ کے ساتھ اُس کی دو ملاقاتیں اسی طرح ہوئیں۔ پھر ایک روز لڑکی کھڑکی میں سے اندر آگئی۔ اسلم باہر نکل گیا۔ شاہدہ چار پانچ منٹ وہاں ٹھہری اور چلی گئی۔ اسلم نے مجھے بتایا کہ اُن کی محبت پاک تھی۔ شفقت نے جوا، شراب وغیرہ سے توبہ کر لی۔

ایک روز شاہدہ کھڑکی میں سے اندر آئی۔ شفقت نے کھڑکی بند کر دی۔ ایک دو منٹ بعد کھڑکی پر کسی نے ہاتھ مارا۔ شفقت نے کھڑکی کھولی۔ باہر شاہدہ کی ماں کھڑی تھی۔ یہ امینہ تھی۔ اسے دیکھ کر شفقت سمجھا کہ شاہدہ کی بہن ہے۔ پینتیس چھتیس سال کی عمر میں وہ شاہدہ سے دو چار سال بڑی معلوم ہوتی تھی۔ وہ غصّے سے لال سُرخ ہو گئی تھی۔ شفقت نے اُسے کہا کہ میں کوئی چوری نہیں کر رہا۔ تمہاری بہن میرے پاس ہے۔ اندر آجاؤ۔

امینہ نے کہا کہ میں اس کی بہن نہیں ماں ہوں۔ وہ کھڑکی میں سے اندر آگئی۔ اسلم بھی اندر آگیا کیونکہ صورتِ حال بگڑ گئی تھی۔ شفقت نے امینہ سے کہا — ”تمہاری بیٹی یہ بیٹھی ہے۔ ہم دونوں نے اپنے درمیان قرآن مجید رکھا ہُوا ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر

سکتی ہو۔ تمہارے پاس میرا باپ آئے گا۔"

اسلم نے بیان دیتے ہوئے کہا ——— "شفقت بڑی دلیری اور جرأت سے بول رہا تھا اور میں ڈر رہا تھا کہ ابھی یہ عورت نیچے جا کر میرے گھر والوں کے سامنے شور مچاتے گی پھر معلوم نہیں محلے میں کیا طوفان کھڑا ہو جاتے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ شاہدہ کی ماں نے نظریں شفقت کے چہرے پر جما رکھی تھیں جیسے وہ اُس کی باتیں سُن ہی نہیں رہی۔ اس نے شفقت سے دبی ہوئی آواز میں پوچھا ——— 'کون ہو تم؟ کہاں رہتے ہو؟' ——— شفقت نے کسی اور گاؤں کا نام لیا۔ اپنے باپ کا نام کچھ اور بتایا اور کہا کہ میرا باپ بہت بڑا زمیندار ہے۔ شاہدہ کی ماں نے سر جھکا لیا پھر سر اُٹھا کر شفقت کو بڑی غور سے دیکھنے لگی ..... شفقت نے اُسے کہا ——— 'مجھے پہچاننے کی کوشش نہ کرو۔ میری نیت خدا جانتا ہے' ——— لیکن شاہدہ کی ماں نے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ اُس نے شاہدہ کی طرف دیکھا اور اُسے سر کے اشارے سے اُٹھنے کو کہا۔ ماں بیٹی کھڑکی میں سے چلی گئیں۔"

## لڑکی اُس کے ساتھ چلی گئی

اسلم نے بڑی لمبی داستانِ محبت سُنائی جو میں اختصار سے سُنا رہا ہوں۔ شفقت اور اسلم بہت حیران تھے کہ شاہدہ کی ماں امینہ اس طرح خاموشی سے کیوں چلی گئی ہے۔ اُنہوں نے یہی ایک وجہ سمجھی کہ وہ بیٹی والی تھی اس لئے اپنی عزت پر پردہ ڈالنے کے لئے چپ رہی۔ شفقت نے اسلم سے کہا کہ اُس نے امینہ کی آنکھوں میں کوئی ایسا اثر محسوس کیا ہے کہ اُس کے دل میں آئی ہے کہ جا کر اس عورت سے معافی مانگے۔ یہ کوئی بڑی ہی پاک اور نیک عورت ہے۔

شفقت اگلے دن بھی وہیں رُکا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ عورت اسلم کے لئے کوئی مصیبت کھڑی کر دے گی مگر کچھ بھی نہ ہُوا۔ اگلے روز شاہدہ کی بجائے



اُس کی ماں اپنی چھت پر آئی۔ شفقت کھڑکی میں کھڑا تھا۔ ماں آہستہ آہستہ چلتی کھڑکی تک آگئی۔ کچھ دیر شفقت کو دیکھتی رہی پھر اتنا کہہ کر چلی گئی ——— "میری بیٹی کو بدنام نہ کر دینا۔"

شفقت اپنے گاؤں چلا گیا۔ دو تین روز بعد پھر آگیا۔ شاہدہ اُسے ملی، پھر شاہدہ کی ماں بھی اُسے ملی ——— اور ایک رات یوں ہُوا کہ شفقت چھت کے راستے اُن کے گھر چلا گیا۔ اُسے شاہدہ نے کہا تھا کہ اُس کا باپ دو دنوں کے لئے باہر چلا گیا ہے۔ واپس آکر شفقت نے اُسے بتایا کہ شاہدہ کی ماں کو اس پر اعتبار آگیا ہے اور وہ اُس کی خاطر تواضع بھی کرتی ہے اور شاہدہ سے ملنے سے نہیں روکتی۔ شفقت نے اُسے اپنا، اپنے باپ کا اور اپنے گاؤں کا نام صحیح نہ بتایا کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو پکڑا نہ جائے اور اُس کا باپ بدنام نہ ہو جائے۔

پھر ایک روز امینہ نے شفقت سے کہا کہ شاہدہ کا رشتہ اس کا باپ بہت بُری جگہ دے رہا ہے اور وہ اُس کی نہیں مانتا۔ وہ اس قدر غصے میں تھی کہ اُس نے شفقت سے کہا کہ وہ شاہدہ کو اپنے ساتھ لے جائے اور جا کر اس کے ساتھ شادی کر لے۔ اُنہوں نے یہ پروگرام طے کر لیا۔

اس کہانی کا یہ حصہ ایسا ہے کہ اس پر یقین نہیں آتا لیکن ان تینوں پر جذبات اتنے غالب آگئے اور انہوں نے ایک دوسرے کا ایسا اثر قبول کیا کہ ایک ناقابلِ یقین مثال قائم کر دی۔ پولیس جانتی ہے کہ اس سے زیادہ ناقابلِ یقین واقعات بھی ہوتے ہیں۔

مقررہ شام شفقت آگیا۔ امینہ کا خاوند سویا ہُوا تھا۔ امینہ نے شاہدہ کو دن کے وقت زیور اور رقم باندھ دی تھی۔ آدھی رات کے وقت شاہدہ آگئی۔ شفقت اور شاہدہ اس طرح نکلے کہ اسلم کے گھر والوں کو بھی پتہ نہ چلا۔ وہ ریل گاڑی کا وقت تھا۔ انہیں پچاس میل دُور ایک شہر میں جانا تھا جہاں اسلم اور شفقت کا ایک دوست ملازم تھا۔ یہ انتظام اسلم جا کر کر آیا تھا۔ اسلم نے بتایا کہ شفقت نے کہا تھا کہ وہ کچھ دن دوست کے پاس

رہے گا لیکن شادی نہیں کرے گا۔ اِدھر ذرا خاموشی ہو جائے گی تو وہ شاہدہ کو اپنے گاؤں لے جائے گا اور اپنے باپ کو تمام حقیقت بتا کر اسے کہے گا کہ ہماری شادی کرا دو۔ وہ باپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسلم نے بیان دیا کہ اُسے پتہ چلا کہ ٹھیکیدار نے امینہ کو مارا پیٹا ہے اور اس کے بازو کی ہڈی توڑ دی ہے تو اسلم پچاس میل دُور شفقت کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ امینہ کو خاوند نے یوں مارا پیٹا ہے اور امینہ ہسپتال میں ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ شفقت اُسی وقت شاہدہ کو اپنے دوست کے سپُرد کر کے بس میں سوار ہو گیا۔ اسلم اس سے پہلے ریل گاڑی سے روانہ ہُوا۔

قصبے میں آ کر شفقت اسلم کے پاس آیا۔ اس کے پاس ایک موٹا ڈنڈہ تھا۔ رات کو وہ چھتوں کے راستے ٹھیکیدار کے گھر میں اُترا اور اسے اس طرح مارا پیٹا اور اس کا بازو بھی توڑا جس طرح ٹھیکیدار نے امینہ کو مارا پیٹا تھا۔ شفقت اسلم کے پاس واپس نہ گیا۔ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ یہ پسنجر ٹرین کا وقت تھا۔ وہ چلا گیا۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو اسلم اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس شہر روانہ کر دیا کہ شفقت اور شاہدہ کو پکڑ کر لے آئیں۔ میں نے شفقت کے باپ کو روکے رکھا۔ اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔

رات کو شفقت اور شاہدہ کو اے۔ ایس۔ آئی لے آیا۔ اُس کا باپ ابھی تھانے میں تھا۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ اس طرح اُس پر جھپٹا جس طرح چیل مُرغی کے بچے پر جھپٹتی ہے۔ اُسے ایسا گلے سے لگایا کہ میں نے اُسے الگ کیا۔ میں نے شفقت سے پہلی بات یہ پوچھی — "تم نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "اپنے باپ کی اجازت سے کروں گا۔"

"نہ کرنا" — میں نے کہا — "خدا نے تمہیں بہت بڑے گناہ سے بچا لیا ہے۔ یہ لڑکی تمہاری بہن ہے۔ تمہیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہے۔"



اُسے تو جیسے غش آنے لگا تھا۔ وہ باپ کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ باپ حیران و ششدر کھڑا تھا۔ باپ نے اُسے بتایا کہ یہ سچ ہے۔ اس لڑکی کی ماں اُس کی ماں ہے اور وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ شفقت بیتاب ہو کر وہاں سے چلنے لگا کہ ماں کو دیکھے لیکن میں نے اُسے روک کر کہا — "اب تم آزادی سے کہیں نہیں جا سکو گے۔ تم قاتلانہ حملے کے ملزم ہو۔ تمہیں ماں سے ملوا دوں گا لیکن حراست میں۔"

"ہاں" — اُس نے بڑی دلیری سے کہا — "میں نے اُسے مارا پیٹا ہے اور اُس کے بازو کی ہڈی بھی توڑی ہے۔"

وہاں بہت باتیں ہوئیں جو لکھنی ضروری نہیں۔ معاملہ جذباتی بھی تھا۔ میں خود شفقت کو ہسپتال لے گیا اور امینہ کو بتایا کہ اس کا انتقام اس کے بیٹے نے لیا ہے۔ ماں بیٹا ایسی دیوانگی کے عالم میں ملے کہ میرا دل بھر آیا مگر یہ کوئی فلمی ڈرامہ نہیں تھا۔ بڑی خوفناک حقیقت تھی۔ شفقت نے ایک آدمی کے گھر میں گھس کر اُسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ امینہ میری منت سماجت کرنے لگی کہ میں اُس کے بیٹے کو گرفتار نہ کروں۔ مجھے اُس پر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی۔

میں نے شفقت کو حراست میں لے لیا۔ اُس نے کہا کہ امینہ کو پہلی بار دیکھ کر اُس نے اپنے وجود میں ایک ایسا اثر محسوس کیا تھا جیسے یہ عورت آسمان سے اُتری ہو اور مجھے اس کے آگے سجدہ کرنا چاہیئے۔ امینہ نے کہا کہ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ شاہدہ ساتھ والے چوبارے کے بالائی کمرے میں گئی ہے۔ وہ بڑے سخت غصے میں وہاں گئی تھی۔ وہ اسلم کے ماں باپ کو بتانا چاہتی تھی کہ تمہارے اُوپر والے کمرے میں کیا ہو رہا ہے لیکن اُس نے شفقت کو دیکھا تو اُس کا غصہ اور ارادے بالکل ہی سرد پڑ گئے۔ وہ اس کیفیت میں شفقت کو دیکھنے لگی جیسے اس نوجوان نے اس پہ جادو کر دیا ہو۔ پھر وہ اس جادو کے ہی اثر میں رہی ورنہ ماں اپنی بیٹی کو یوں گھر سے نہیں بھگا سکتی۔

شفقت نے اقبالی بیان دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسلم کو

اعانتِ جرم میں گرفتار کیا اور کیس تیار کیا۔ اس میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ مجھے شہادت اکٹھی کرنی تھی۔ اس ایک ہفتے کے دوران ٹھیکیدار نے امینہ کو طلاق دے دی۔ شفقت کا باپ ہر روز تھانے آتا تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ امینہ کو طلاق مل گئی ہے تو وہ ہسپتال گیا جہاں امینہ کا باپ امینہ کے پاس سر پکڑے بیٹھا تھا۔ شفقت کے باپ نے اُسے کہا — "اگر تم لوگ قبول کرو تو میں امینہ سے نکاح پڑھا لوں گا اور اس کی بیٹی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"

دونوں نے قبول کر لیا۔

کیس چلا لیکن ناکام ہو گیا۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہ تھا۔ شفقت، امینہ اور اسلم کے باپوں نے بڑے قابل وکیل کئے تھے۔ شفقت کو دوسرے شہر سے پکڑا گیا تھا۔ ان لوگوں نے ثابت کر دیا کہ شفقت واردات کے شہر میں تھا ہی نہیں۔ شفقت اور اسلم بری ہو گئے۔